(زین العابدین خاں عارفؔ)

ترتیب وتدوین

ڈاکٹر وسیم بیگم

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

انتخاب

کُلیاتِ عارف

(زین العابدین خاں عارفؔ)

انتخاب

کلیاتِ عارف

(زین العابدین خاں عارفؔ)

ترتیب و تدوین:

ڈاکٹر وسیم بیگم

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

INTKHAB KULIYAT -E- ARIF
(Zainul Abidin Khan Arif)
Edited BY :
Dr. WASIM BEGUM

I.S.B.N. 81-8172-029-6

اہتمام : شاہد ماہلی
اشاعت : ۲۰۰۹ء

مطبوعہ : اصیلا پرنٹنگ پریس

غالب انسٹی ٹیوٹ،
ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲
www.ghalibinstitute.com– E-mail: ghalib@vsnl.net

پیش لفظ

انیسویں صدی اردو شعروادب میں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس دور نے مرزا غالبؔ، مرزا سوداؔ، ابراہیم ذوقؔ اور مومن خاں مومنؔ جیسے غزل کے اساتذہ کو جنم دیا۔ غالبؔ تو اُس صدی کے وہ شاعر ہیں جنھیں بین الاقوامی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اور تقریباً دنیا کی تمام زبانوں میں ان کے دیوان کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسی دور کے ایک شاعر نواب زین العابدین خاں عارف بھی ہیں۔ عارف، غالبؔ کی بیگم کے سگے بھانجے اور قریبی عزیزوں اور شاگردوں میں تھے۔ ان کی پیدائش ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء میں ہوئی، آج تقریباً دو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کی شاعری کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہیں آسکا۔ ان کے خاندان کے متعلق بھی ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ اِنھیں سب وجوہات کی بنا پر غالب انسٹی ٹیوٹ نے عارف کے کلیات کی ایک زیروکس کاپی رام پور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر وقارالحسن سے حاصل کی۔ ہم ان کے مشکور ہیں کہ اس مسوّدے کو حاصل کرنے میں اُنھوں نے ہمارے ساتھ پورا تعاون کیا۔ عارف کے اس کلیات کو وسیم بیگم کو دینے کا فیصلہ کیا گیا اور انھوں نے کلیاتِ عارف کی ترتیب وتدوین کے اس اہم کام کو بڑی محنت، لگن اور سوجھ بوجھ کے ساتھ مکمل کیا۔

عارف کے کلیات کو تدوین دینے سے پہلے وسیم بیگم نے تقریباً سو صفحات کا مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں عارف اور ان کے خاندان کا احوال بھی بیان کیا ہے اور ان کی شاعری

سے متعلق بھی اہم نکات پر روشنی ڈالی ہے۔ عارف کو شاعری کے ساتھ مشاعرے منعقد کرانے کا بھی بہت ذوق وشوق تھا اور بڑے سلیقے کے ساتھ وہ ان مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے۔ خود عارف کے الفاظ میں فرحت اللہ بیگ نے یہ لکھا ہے:

''میاں کریم الدین کو بات تو اچھی سوجھی ہے مگر اس کا نباہنا مشکل ہے۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں کاملانِ فن جمع ہو جائیں''۔

(دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، مرزا فرحت اللہ بیگ، ص ۹)

عارف کا کلیات بہت ضخیم ہے، یہ دو دواوین پر مشتمل ہے اور سات سو بہتر (772) صفحات پر مشتمل ہے۔ موجودہ نسخے کے ساتھ کوئی تقریظ، ترقیمہ یا تعلیقہ نہیں ہے، کوئی تاریخِ تکمیل بھی نہیں ہے جس سے اس کے تدوین کے مسائل پر روشنی پڑ سکے۔ دیوانِ اول کا آغاز قصائد سے ہوتا ہے، اس کے علاوہ دوسری اصناف سلام، مسدس، مخمس کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ سب سے بڑی تعداد میں غزلیں ہیں، ان کی کل تعداد دو سو ننانوے (299) ہے۔

دوسرے دیوان کا نام 'مطلع مہر سعادت' ہے، اس میں غزلوں کی کل تعداد اٹھتر (78) ہے۔ غزلوں کے اندراج کے بعد قطعات، قصائد، سلام اور نعتیہ مخمس کو شامل کیا ہے۔

وسیم بیگم نے دیوانِ اول و دوم کی غزلیات کا انتخاب اس طرح کیا ہے کہ اس میں عارف کا تمام کلام بھی سامنے آجائے اور اس کا ایک اچھا انتخاب بھی۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ ہر غزل کے پانچ یا سات شعر پیش کر دیے جائیں اور ان میں مطلعے اور مقطعے کو ضرور شامل کیا جائے۔ اس طرح عارف کی شاعری کی خصوصیات بھی سامنے آگئیں اور اس زمانے کے رجحانات بھی۔ عارف کی دوسری اصناف کا بھی الگ الگ تعارف کرایا ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکا ان کی نشانِ راہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

عارف نے چند غزلیں غالب کی زمین میں بھی کہی ہیں۔ عارف کی غزل کا ایک مطلع ملاحظہ ہو:

سب سے بہتر ہے کہ مجھ پر مہرباں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو

عارف کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ ان کے زمانے میں ان کی شاعری کی کسی نے قدر نہیں کی، ان اشعار سے عارف کی احساسِ برتری اور ان کے شخصی خیالات و جذبات کا آسانی سے پتہ لگایا جاسکتا ہے:

عارف غزل اک اور سُنا اس سے بھی بہتر
سب آج تجھے کہتے ہیں سودا کے برابر
کیا ہے کلام میر سے میرا کلام کم؟
پر قدرداں نہیں کوئی عارف ہزار حیف

عارف کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک ہی زمین میں پانچ غزلیں کہی ہیں، اس اعتبار سے عارف اپنے زمانے کے اساتذۂ سخن میں نہ ہونے کے باوجود استادانہ اندازِ نظر رکھتے ہیں اور اپنی شاعری پر فخر بھی کرتے ہیں:

کون کہہ سکتا ہے یاں میرے برابر ریختہ
شک نہیں عارف کہ ہے بس یہ زباں میرے لیے

عارف کا زیادہ تر کلام عاشقانہ ہے لیکن بہت سے شعر اُستادانہ رنگ لیے ہوئے ہیں:

وہ پوچھتے ہیں جو جم کے برسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
کہ لرزے رو رو ہے کس کے ڈر سے فلک پہ بجلی زمیں پر باراں

یہ شاہ نصیر کی زمین ہے جو اپنی مخصوص ساخت کے لحاظ سے اردو شاعری کے اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے۔

کلیاتِ عارف کی ترتیب و تدوین جو ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن وسیم بیگم نے اس کام کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ کلیات میں کتابت اور املا کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ دوسرے قدیم طرزِ کتابت کی وجہ سے مسوّدے کا پڑھنا ایک دشوار گزار مرحلہ تھا، اس کے باوجود وسیم بیگم کامیابی کے ساتھ ان سب امور سے گزری ہیں۔ ان کو اس کام میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسے صاحبِ نظر حضرات کی رہنمائی حاصل رہی۔ آخر میں اس پورے کلیات پر نہایت محنت، مشقت اور جاں فشانی کے ساتھ پروفیسر اسلم پرویز نے نظرِ ثانی کی۔

وسیم بیگم نے پہلی مرتبہ زین العابدین خاں عارف کے کلیات کو بسیط مقدمے کے ساتھ انتخاب و تدوین کیا ہے، یہ کلاسکی شاعری پر ایک بڑا اور اہم کام ہے۔ انھوں نے جس طرح تحقیق اور متنی تنقید کے اصول و ضوابط کو اپنایا ہے بلاشک وشبہہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا یہ کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے۔

کُلیاتِ عارف کا ایک مکمل نسخہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں موجود ہے۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

سکریٹری، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

عارفؔ اور اُن کا خاندان

نواب زین العابدین خاں عارفؔ مرزا غالبؔ کی بیگم کے سگے بھانجے اور قریبی عزیزوں اور شاگردوں میں تھے۔ ان کی پیدائش ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۸۱۷ء میں ہوئی۔ عارفؔ کے بارے میں مولوی کریم الدین کا یہ بیان ایک اہم دستاویزی شہادت کا درجہ رکھتا ہے:

"جائے پیدائش اور وطن عارفؔ کا شاہ جہاں آباد ہے، لڑکپن سے آج تک یہیں رہے کہیں کا سفر نہیں کیا مکان اُن کا لال کنویں پر ہے جو مدرسے کے نام سے مشہور ہے۔"[1]

عارفؔ اپنے نسبی سلسلے کے اعتبار سے اُس وقت کے ممتاز اہلِ خاندان سے تھے اور ان کا تعلق نواب قاسم جان اور ان کے چھوٹے بھائی نواب عارف جان کے خانوادے سے تھا۔ عارف جان کو اپنی فوجی خدمات کے سلسلے میں جو جاگیریں ملی ہوں گی ہم ان کی تفصیلات سے آگاہ نہیں مگر عارف جان کے بڑے بیٹے نواب احمد بخش خاں نے اپنے زمانے میں ریاست الور اور بعد ازاں لارڈ لیک کی کمان میں رہتے ہوئے جو فوجی خدمات انجام دیں ان کے نتیجے میں وہ فیروز پور جھرکا اور لوہارو پرگنے کے رئیس بن گئے۔ شاہی دربار سے انھیں فخر الدولہ دلاور الملک کا خطاب بھی ملا، جس کو انگریزوں نے بھی ان کی دوستی کے پیشِ نظر تسلیم کیا۔ اس طرح نواب احمد بخش خاں، جن کا انتقال ۱۸۲۷ء مطابق ۱۲۴۲ھ میں ہوا، وہ فیروز پور جھرکا اور لوہارو کے رئیس سمجھے جاتے تھے اور وہ خاندانی رئیس زادے تھے اس لیے ان کا دہلی کے شرفا کے حلقے میں بہت احترام کیا جاتا تھا، ان کے بیٹے نواب شمس الدین

---

[1] بحوالہ: خاندانِ لوہارو کے شعرا، بیگم حمیدہ سلطان، ص ۶۹، جون ۱۹۸۱ء۔

احمد خاں ان کے بعد ریاست کے مسند نشیں ہوئے، ان سے اور انگریزی Resident ولیم فریزر سے کسی بات پر شدید اختلاف ہوگیا جس کے نتیجے میں شمس الدین احمد خاں کے اشارے پر ان کے دو آدمیوں نے ولیم فریزر کو قتل کردیا۔ اس قتل کی پاداش میں انگریز سرکار نے نواب شمس الدین احمد خاں کو گرفتار کیا اور پھر انھیں پھانسی کی سزا دی گئی۔ نواب میرزا خاں داغؔ دہلوی انھیں شمس الدین کے بیٹے تھے جن کی پرورش لال قلعے میں ہوئی۔ داغؔ کی والدہ نے شمس الدین کے پھانسی پانے کے بعد بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخرو سے نکاح کرلیا تھا۔ ریاست فیروز پور جھرکا ضبط ہوگئی صرف پرگنہ لوہارو اس خاندان کے تصرف میں رہ گیا۔ نواب امین الدین احمد خاں ان کے چھوٹے بھائی ضیاء الدین احمد خاں نوابانِ لوہارو کہلاتے تھے اور انھیں کے سلسلے سے یہ خاندان لوہارو خاندان کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ خاندان عہدِ محمد شاہی میں ہرات سے ہندوستان آیا تھا، غالباً اسی دور میں غالبؔ کے دادا مرزا قوقان بیگ کا بھی ہندوستان میں ورود ہوا۔ نواب معین الملک خواجہ عبدالرحمٰن یسوی پہلے میر قمرالدین خاں عرف میر منّو کی سرکار سے وابستہ رہے جو اُس وقت مغل حکومت کے اس علاقے میں ایک صاحبِ اقتدار امیر یا صوبہ دار تھے۔ میر منّو کی وفات کے بعد یہ سرکار درہم برہم ہوئی تو عبدالرحمٰن یسوی نے دہلی کا رخ کیا اور شاہ عالم ثانی کے دربار سے وابستگی اختیار کی۔ ان کے متعلق بیگم حمیدہ سلطان نے لکھا ہے کہ:

> ''بادشاہ کے ہمراہ تینوں بھائی دہلی آئے اور یہیں سکونت اختیار کی، بلّیماروں کے محلے میں قاسم جان کی گلی انھیں سے منسوب ہے اور اب بھی ان کے خاندان کے افراد اس گلی میں سکونت رکھتے ہیں'' [1]

نواب غلام حسین خاں مسرور زین العابدین خاں عارفؔ کے والد تھے، ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی بنیادی بیگم سے ہوئی تھی جو مرزا غالبؔ کی بیوی کی بڑی بہن تھیں۔ مسرور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے لااُبالی طبیعت کے انسان تھے اور اُس زمانے کے رئیسانہ مشاغل میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ اسی لیے ریاست بہت جلد ہاتھ سے نکل گئی، اُس کی جگہ عارفؔ کو سرکارِ انگلشیہ سے ڈھائی سو روپے ماہوار ملتا تھا۔ اس زمانے کے بیشتر رئیس زادے اور شُرفا کی اولادیں زیادہ تر خاندانی جائیدادوں یا پھر ریاستی یا

---

1. خاندانِ لوہارو کے شعرا، بیگم حمیدہ سلطان، ص ۶۳، جون ۱۹۸۱ء۔

سرکاری وثیقوں پر گزر کرتی تھیں، غالبؔ بھی انھیں میں سے ایک تھے۔

نواب غلام حسین خاں مسرور کے انتقال کے بعد عارفؔ کی پرورش کی ذمے داری غالبؔ نے لے لی۔ ہم عارفؔ کو غالبؔ کی زندگی میں بہت بچپن سے شریک نہیں پاتے نہ غالبؔ اس کا ذکر کرتے ہیں اور نہ ان کے خطوں میں ایسا کوئی حوالہ آتا ہے۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے ضرور یہ لکھا ہے کہ جب امراؤ بیگم یعنی غالبؔ کی شریکِ حیات کے یہاں یکے بعد دیگرے سات اولادیں عالمِ شیر خواری میں ہی فوت ہو گئیں تو بنیادی بیگم نے ان کے بے اولاد ہونے کے غم کو کم کرنے کے لیے اپنے بیٹے عارفؔ کو انھیں گود دے دیا۔

نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ، زین العابدین خاں عارفؔ کے نانا تھے اور اُن کی سرپرستی ان کے نانا کی طرف سے بھی ہوتی رہی اور ان کے نانا کے بڑے بھائی فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں رستم جنگ کی طرف سے بھی۔

نواب احمد بخش خاں کی بیٹی عارفؔ کے نکاح میں آئی تھیں اگرچہ وہ زیادہ دنوں تک حیات نہیں رہیں لیکن اس طرح عارفؔ لوہارو خاندان کے داماد بن گئے، ان کو لوہارو ریاست سے ڈھائی سو روپیہ ماہوار وظیفہ بھی ملتا تھا، یہی غالباً ان کا واحد ذریعۂ آمدنی بھی تھا۔ گمان غالب ہے کہ پنشن عارفؔ کو ان کی زوجہ کی وفات کے بعد تا زیست ملتی رہی۔

نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ خاندانی جائیداد یا اس سے وابستہ وثیقے پر زندگی گزارتے رہے، ان کی آمدنی کے دوسرے ذرائع کیا تھے اس کا کہیں ذکر نہیں آیا لیکن وہ ایک خاندانی رئیس خیال کیے جاتے تھے جس کی طرف سب نے اشارہ کیا ہے۔ ان کی زندگی کے واقعات ہمیں پوری طرح معلوم نہیں، وہ غالبؔ کے خسر تھے اور ان کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم ۱۰-۱۸۰۹ء میں غالبؔ کے نکاح میں آئیں تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت غالبؔ کی عمر تیرہ برس اور امراؤ بیگم کی بارہ برس تھی۔ ممکن ہے غالبؔ کچھ عرصہ اپنی سسرال میں بھی گھر داماد کی حیثیت سے رہے ہوں لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دوسری حویلیوں یا مکانات میں گزرا جو گلی قاسم جان کے آس پاس ہی تھے۔

محمد حسین آزاد نے 'آبِ حیات' میں معروفؔ کا ذکر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ معروفؔ ذوقؔ دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی کتاب 'ذوق: سوانح اور انتقاد' میں اس طرح کے شواہد ملتے ہیں کہ ذوقؔ دہلوی، نواب معروفؔ کی غزل بناتے تھے، معروفؔ

کے تخلص کے ساتھ ایک غزل ذوقؔ کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ملتی ہے، وہ یا تو معروفؔ کے لیے لکھی گئی ہوگی یا کسی مسودے سے، جو ذوقؔ کا اپنا بھی ہوسکتا ہے، نقل کی گئی ہوگی۔

محمد حسین آزاد کی رائے سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اب اس سے اختلاف ممکن نہیں کہ معروفؔ، ذوقؔ دہلوی کو بھی اپنی غزل دکھلاتے تھے، ویسے باقاعدہ طور پر معروف شاہ نصیر کے شاگرد تھے جو اس زمانے میں دہلی کے ممتاز اساتذۂ سخن میں شمار کیے جاتے تھے۔

شاہ نصیر شاہ غریب کے بیٹے تھے اور فقر و تصوف کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کا اپنا مزاج صوفیانہ نہیں تھا، شعر و سخن میں بھی وہ صوفیانہ مضامین سے کوئی خاص علاقہ نہ رکھتے تھے، اس کے مقابلے میں وہ مشکل زمینوں میں شعر کہنے کو ترجیح دیتے تھے اور اپنے زمانے کے شعری رویوں کے مطابق غزل کہتے تھے۔ وہ مومن کے بھی استاد رہے تھے۔

نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کا دیوان محمد عبدالحامد قادری معینی بدایونی نے نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ معروفؔ نے اپنے اساتذہ کا اثر کس حد تک قبول کیا یہ کہنا قدرے مشکل ہے، ان کا اپنا رنگ الگ تھا اور اس میں تصوف اور روحانیت کی چاشنی بھی تھی، سلاست، سادگی اور روانی ان کے اشعار میں نمایاں طور پر موجود ہے، انھیں دوسرے شعرا کے اچھے کلام کو پسند کرنے کا اس حد تک شوق تھا کہ وہ دوسرے اساتذہ کی غزلوں پر تضمینیں لکھتے تھے۔ اپنے داماد یعنی غالبؔ کی دو غزلوں پر بھی انھوں نے تضمین کی ہے۔ ذوقؔ دہلوی کی غزلوں پر بھی اور بعض دوسرے اساتذہ کی غزلوں پر بھی۔ انھوں نے سبز رنگ کو نقطۂ فکر بنا کر ۱۰۱ اشعر کہے ہیں، جس کا نام 'تسبیحِ زمرد' رکھا گیا تھا۔ محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ: "یہ تسبیح بھی ذوقؔ مرحوم نے پروئی تھی"۔ اس کی تصدیق کسی اور مآخذ سے نہیں ہوئی۔ ممکن ہے انھوں نے اس کے اشعار پر نظرِ ثانی کی ہو یا ان کی تلاش اور ترتیب میں اپنی توجہ صرف کی ہو مگر یہ تمام تر انھیں کی تخلیق تھی، یہ ماننے میں بجا طور پر تامل ہوتا ہے۔ اسی خاندان کی ایک بیٹی حاجی بیگم کی شادی ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں سے ہوئی تھی جو قاسم جان کے چھوٹے بھائی عارف جان کے بیٹے تھے، ہم اس خاندان کے شجرے کو اس طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

ل شاہ نصیر کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا، ان کے سب سے زیادہ نمایاں شاگرد میں ذوقؔ دہلوی کا نام ہے جن سے تعلقات کشیدہ بھی ہوگئے تھے، شاہ نصیر کے دکن جانے کے بعد غالبؔ نے ایک خط فارسی میں شاید ذکا سے شاہ نصیر کے حالات کے بارے میں دریافت کیا تھا، ایک روایت کے مطابق غالبؔ نے بھی ابتدا میں اپنا کلام شاہ نصیر کو دکھلایا تھا لیکن غالبؔ نے اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔

خاندانِ عارف کا شجرہ
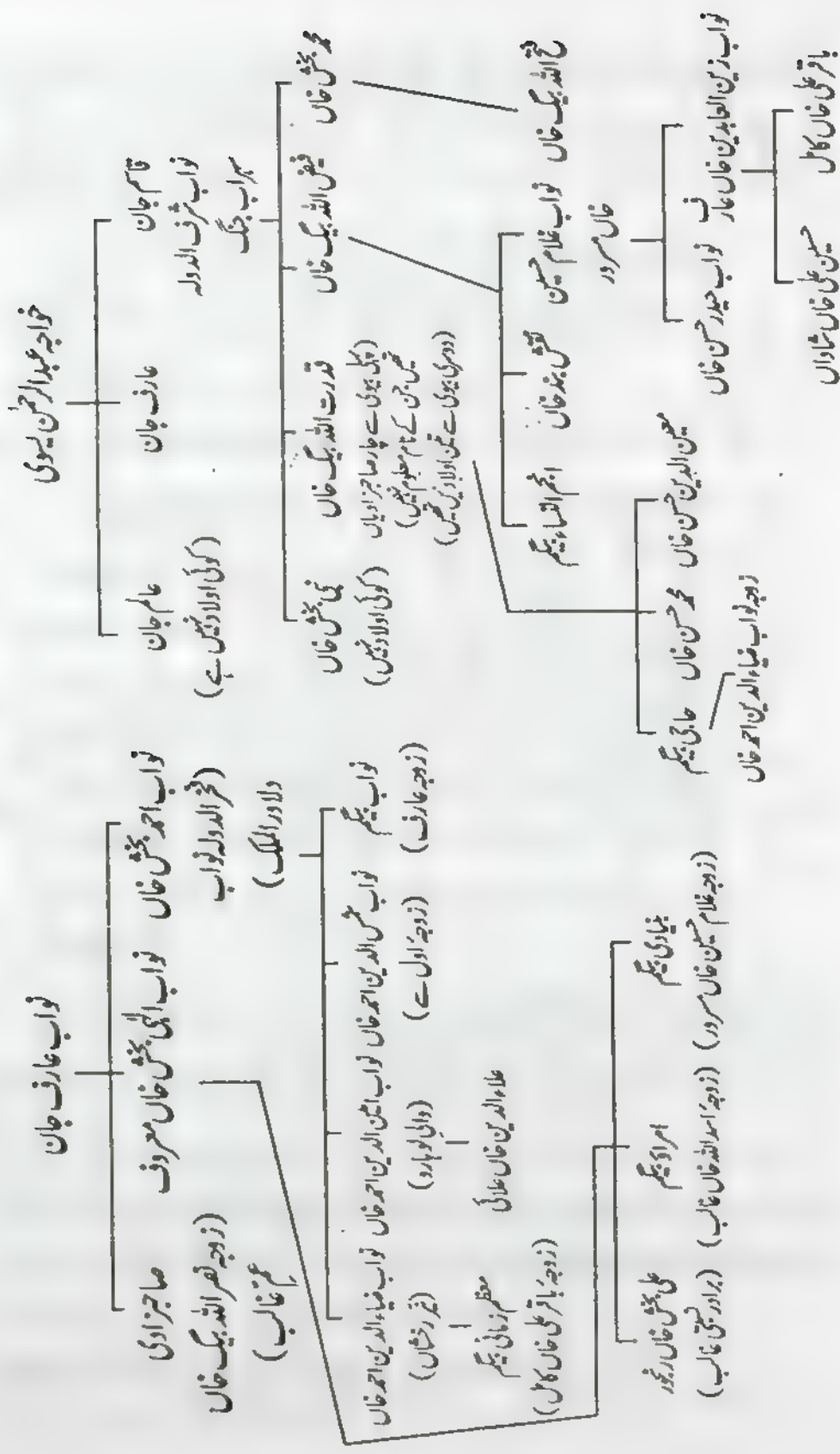
عارفؔ کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں تو کوئی خاص معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ عارفؔ کے چہرے مہرے اور قد و قامت کے بارے میں مولوی کریم الدین نے ان کے ترجمے میں لکھا ہے:

"بہت دُبلا پتلا ہے لانبا قد ہے داڑھی بھر کر نہیں نکلی، تھوڑی پر ہی کچھ بال ہیں۔ خُلق اس کا بہت اچھا ہے، اگر کوئی اس سے ملاقات کرے بہت حظ اٹھائے"۔[1]

فرحت اللہ بیگ نے 'دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ' میں عارفؔ کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

"نواب زین العابدین خاں عارفؔ پر نظر پڑی... بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں، لال کنویں کے پاس ایک حویلی ہے اس کو مدرسہ بھی کہتے ہیں وہاں رہتے ہیں کوئی تیس سال کی عمر ہے۔ گوری رنگت، اونچا قد، جامہ زیب آدمی ہیں البتہ داڑھی بھر کر نہیں نکلی ہے تھوڑی پر کچھ گنتی کے بال ہیں غالبؔ کے بھانجے ہیں (دیکھیے حاشیہ[3]) اور شاگرد بھی۔ کچھ عرصے تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے بہر حال ان کی محبت، ان کی شرافت اور سب سے زیادہ ان کی رسوخ نے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں ان کی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا"۔[2]

یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ عارفؔ نے غالبؔ کی شاگردی قبول کی، اس کے علاوہ غالبؔ کو ان سے بے حد قلبی لگاؤ بھی تھا اس کا ذکر خود غالبؔ نے فارسی کے اس شعر میں کیا ہے:

---

[1] تذکرہ شعرائے ہند، مولوی کریم الدین ۱۸۴۷ء، یہ تذکرہ راقمہ نے نہیں دیکھا۔ اس کا ذکر حمیدہ سلطان احمد نے 'لوہارو خاندان کے شعرا' میں کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 'خاندانِ لوہارو کے شعرا'، ص ۶۸۔

[2] دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، مرزا فرحت اللہ بیگ، ص ۹-۸، کراچی پاکستان۔

[3] غالبؔ کی بیوی امراؤ جان کے بھانجے۔

آں پسندیدہ خوئے عارف نام
کہ رُخش، شمعِ دود مانِ مَنَست

(وہ ستودہ صفاتِ انسانی جس کا نام عارف ہے، جو میرے خاندان کا چراغ روشن ہے۔)

آں کہ در بزمِ قُرب وخلوتِ اُنس
غمگسار و مزاج دانِ مَنَست

(بزمِ قُرب اور خلوتِ اُنس میں میرا خدمت گزار اور مزاج داں ہے۔)

ہم ز کلکِ تو، خوش دلم خوش حال
کاں نہالِ ثمر فشانِ مَنَست

(عارفؔ کے ہاتھ میں جو قلم رہتا ہے میرا دل اُس سے خوش رہتا ہے تیرا قلم میرے شجرِ امید کی شاخ ہے جس سے برابر ثمر افشانی ہوتی رہتی ہے۔)

عارف اور دہلی کے مشاعرے

اس میں کوئی شک نہیں کہ عارفؔ کا مزاج شاعرانہ تھا جیسا کہ غالبؔ کے ان فارسی شعروں سے بھی ظاہر ہوتا ہے اور اس کے علاوہ ان کو شاعری کے ساتھ ساتھ مشاعروں سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ غالبؔ نے عارفؔ کے شعر وسخن سے اس شفقت کو اپنے کئی خطوں میں ظاہر کیا ہے۔

عارفؔ کے تعلقات اپنے قریبی رشتے داروں اور عزیزوں میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاںؔ کے ساتھ کچھ زیادہ گہرے تھے اس کا سبب خاندانی رشتوں کی قربت کے ساتھ ساتھ ادب وشعر کے ساتھ دونوں کی دلچسپی بھی تھی۔

عارفؔ رئیس زادے تھے اس لیے اپنی روزی پیدا کرنے کی فکر سے آزاد تھے اور یوں وہ فکرِ سخن میں لگے رہتے تھے جس کی طرف مولوی کریم الدین اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر سے کمالِ ارتباط اور صحبت اس کو رہتی ہے چوں کہ دونوں صاحب وجہ معیشت سے فارغ اور نواب زادے ہیں باہم شعر وسخن کا چرچا اور صحبت رکھتے ہیں"۔[1]

---

[1] بحوالہ 'خاندانِ لوہارو کے شعرا' حمیدہ سلطان احمد، ص ۶۹، جون ۱۹۸۱ء۔

مولوی کریم الدین کا یہ بیان جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا اس لیے بھی اہم ہے کہ عارفؔ ۱۲۶۱ھ میں مولوی صاحب کے مکان پر جو تاریخی مشاعرہ ہوا تھا اس میں شریک تھے اور کریم الدین کے قائم کردہ مشاعروں میں برابر شرکت کرتے رہتے تھے، بقول کریم الدین:

> ''اس سال ۱۲۶۳ھ میں عمر اس کی قریب تیس برس یہ اشعار شاعرِ مذکور ہیں جو مشاعرے میں میرے مکان پر پڑھے تھے، واضح ہو کہ یہ مشاعرہ میرے مکان پر چودھویں تاریخ رجب ۱۲۶۱ھ میں شروع ہوا'' [1]

اسے ہم ایک معاصر شہادت کے طور پر زیادہ اہمیت دے سکتے ہیں اور اس سے عارفؔ کی شاعری اور اُن کے ادبی شعور کا پس منظر سامنے آتا ہے۔ 'دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ' میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس کا تذکرہ کیا ہے:

> ''اگرچہ یہ مشاعرہ مولوی کریم الدین مرحوم کے گھر پر ہوا تھا اور یہی اس مشاعرے کے روحِ رواں تھے لیکن اس مشاعرے کا اہتمام عارفؔ کے ہاتھوں ہوا تھا'' [2]

خود عارفؔ کے الفاظ میں فرحت اللہ بیگ نے یہ لکھا ہے:

> ''میاں کریم الدین کو بات تو اچھی سوجھی ہے مگر اس کا نباہنا مشکل ہے۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں کاملانِ فن جمع ہو جائیں'' [3]

اگرچہ عارفؔ کی طبیعت اسوقت خراب تھی لیکن شوق کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ انھوں نے اس کے باوجود مشاعرے کے اہتمام میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ عارفؔ اپنے گھر پر بھی مشاعرے کرتے تھے جن میں بڑا وقت بھی صرف ہوتا تھا اور اس زمانے کے اساتذۂ سخن کی ناز برداریوں کو نباہنا اور ان کے مرتبے کے مطابق ان مشاعروں کا اہتمام ایک مشکل امر تھا مگر عارفؔ اپنی فطری صلاحیت اور مزاج کی شائستگی کے اعتبار سے ان فرائض سے عہدہ برآ ہوتے تھے مگر ایسے کسی مشاعرے کا ذکر غالبؔ نے نہیں

۱۔ بحوالہ 'خاندانِ لوہارو کے شعرا' حمیدہ سلطان احمد، ص ۶۹، جون ۱۹۸۱ء۔

۲۔ دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، مرزا فرحت اللہ بیگ، ص ۹ (سنِ طباعت موجود نہیں)۔

۳۔ ایضاً

کیا۔

۱۸۴۲ء کے آس پاس غالبؔ نے قلعۂ معلّٰی میں ہونے والے مشاعروں کا ذکر کیا ہے اوران میں انھوں نے اپنا کلام پیش کیا، ان کی طرف بھی ان خطوط میں اشارے موجود ہیں۔ عارفؔ نے ان مشاعروں میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا اور غالبؔ کو قلعے تک لے جانے کے فرائض میں وہ شریک رہے۔ غالبؔ کے خطوط کے حوالے سے ہم ان حقائق سے واقف ہیں، لیکن ایسے کسی مشاعرے کا تذکرہ غالبؔ یا ان کے کسی دوسرے معاصر کے یہاں نہیں ملتا جو عارفؔ کے اہتمام سے ان کے گھر پر ہوا ہو۔ بہر حال اس روایت کو قرینِ قیاس تو کہا ہی جاسکتا ہے۔

غالبؔ کی شاگردی

یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ عارفؔ، غالبؔ کے شاگرد تھے اور ان سے متاثر تھے، وہ روایتی طور پر ان کے شاگرد ہوں یہ بالکل ممکن ہے، اپنا کلام بھی بغرضِ اصلاح انھوں نے غالبؔ کو دکھایا ہو اس امکان سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا لیکن کلیاتِ عارف میں جو ہزار ہا اشعار پر مشتمل ہے غالبؔ کے رنگ کے اشعار اس میں بالکل نہیں ہیں۔ غالبؔ نے اگر اصلاح دی ہوتی تو عارفؔ کوئی منتخب دیوان بھی تیار کرتے کہ غالبؔ کا مشورہ یہی ہونا چاہیے تھا اور کچھ شعروں پر غالبؔ کی اصلاح کی وجہ سے غالبؔ کے فکر وخیال کی پرچھائیاں ضرور ہوتیں جو ہمیں نہیں ملتیں۔ ایسا کیوں ہے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ عارفؔ کے ہاں بعض غزلیں غالبؔ کی زمینوں میں بھی ہیں اور ان غزلوں کا انداز بھی قدرے مختلف ہے مثلاً غالبؔ کی زمین میں ان کی اس غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

سب سے بہتر ہے کہ مجھ پر مہرباں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اپنی تحریروں میں اس بات کا بہت ذکر کیا ہے اور بار بار کیا ہے کہ عارفؔ کے رنگِ سخن پر غالبؔ کا گہرا اثر مرتّب ہوا ہے، یہ بات قرینِ قیاس ہے لیکن عارفؔ کا کلیات دیکھنے پر ایسا کچھ نظر نہیں آتا کہ عارفؔ کے رنگِ سخن پر غالبؔ کے ندرتِ اسلوب اور جدتِ ادا کا کوئی اثر مرتّب ہوا ہے، یہ صرف سوچ لیا گیا ہے۔ ان کے زمانے

میں جو تذکرے ان کے ترجموں سے متعلق ہیں ان میں بھی غالبؔ کی شاگردی کا ذکر تو ہے مگر عارفؔ کے کلام پر غالبؔ کے اثرات کو نمایاں نہیں کیا گیا۔

ایسی صورت میں یہ سطور غور طلب ہیں اس لیے کہ حمیدہ صاحبہ نے ایسا ایک مخمس اور غزل کا مطلع پیش کیا ہے جن کا شعری اور شعوری رشتہ غالبؔ کی زمینِ سخن سے قائم ہوتا ہے لیکن عارفؔ کے کلام کا ایک بہت بڑا حصہ جو صدہا نہیں ہزاروں شعروں پر مشتمل ہے وہ اس طرح کے نمونوں سے خالی ہے اور اس زمانے کا جو رنگ اور پُر گوئی کا جو شعری اور ادبی انداز پسندیدہ تھا اور رہا اس کی مثالیں عارفؔ کے یہاں ملتی ہیں۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے مزید یہ بھی لکھا ہے کہ:

> "عارفؔ نے غالبؔ کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی ہے اور اس میں
> وہ کامیاب رہے ان کی ایک غزل اور ایک مخمس بھی غالبؔ کی غزلوں
> پر پیش ہے"۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 'خاندانِ لوہارو کے شعرا' ص ۷۰)

غزل کا مطلع اس سے پیشتر نقل ہو چکا ہے، مخمس غالبؔ کی زمین میں ہے اور اس کے اشعار کو تضمین کیا گیا ہے لیکن زبان میں جو ڈھیلا ڈھالا پن ہے وہ غالبؔ کا رنگ نہیں ہے اور غالبؔ اس پر اصلاح دیتے تو زبان ایک گونہ کسی ہوئی ہوتی اور 'مدت ہوئی ہے' کی تکرار کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

مدت ہوئی ہے عیش کا ساماں کیے ہوئے ۔۔۔ روشن چراغِ مے سے شبستاں کیے ہوئے
مدت ہوئی ہے حجرہ گلستاں کیے ہوئے ۔۔۔ مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

یہ تضمین بہ صورتِ مخمس حمیدہ سلطان صاحبہ نے اپنی کتاب میں نقل کی ہے اس کے جو اور بند بھی پیش کیے گئے ہیں ان کا انداز بھی لگ بھگ وہی ہے جو اس سے پہلے بندوں کا ہے اور ایک آدھ بند کے علاوہ کسی بند پر غالبؔ کے اپنے خاص طرزِ بیان کی وہ پرچھائیاں نہیں ہیں جو اس کے رنگ کو غالبؔ کے رنگ سے ہم آہنگ کر سکیں۔ مندرجہ ذیل بند ضرور ایسا ہے جسے غالبؔ کے زیرِ اثر کہے ہوئے شعروں کا ایک نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے:

پھر تارِ سازِ شکوۂ دلدار ہے نَفَس ۔۔۔ پھر پیرہن میں حوصلہ کے خار ہے نَفَس

پھر داغِ شعلہ خیزیِ اظہار ہے نفَس　　　پھر گرمِ نالہ ہائے شرر بار ہے نفَس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

شاعروں کو اپنے زمانے اور زمانے والوں سے اکثر شکایت رہتی ہے، غالبؔ کے یہاں بھی دہلی والوں کی شکوہ سنجی پر مشتمل اشعار موجود ہیں اہلِ دہلی سے شکایت عارفؔ کی شاعری کا بھی ایک خاص پہلو ہے جسے اِن اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے:

عجائب لوگ ہیں دہلی میں عارفؔ　　　خدا جانے کہاں کے ہیں کدھر کے
نہیں کچھ اس میں شک رہتے ہیں دشمن　　　فلک سے بھی سوا اہلِ ہنر کے
ہمارا شعر گو ہو سب سے بہتر　　　سنیں اس کو نہ ہرگز کان دھر کے

اِن اہلِ دہلی میں وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور رہے ہوں گے جو مشاعروں میں ایک دوسرے کی ہنسی اُڑاتے ہیں، فقرہ بازی کرتے ہیں۔ ایک طویل قطعے میں عارفؔ نے اسی طرح کے لوگوں اور مجالسِ اہلِ سخن میں اسی انداز کی ممانعتوں کی طرف اشارہ کیا ہے:

بات ہی جن کو گر نہیں آتی　　　زعم میں جو اپنے ہوگئے استاد
تھا اثر وہ کلام شیریں کا　　　بند جس سے ہوئے لبِ حسّاد
شکوہ کس کا کروں کہ ہیں مجبور　　　شعر سمجھیں وہ کیا نہ ہو جو سواد

اس جگہ عارفؔ کا ایک اور شعر یاد آرہا ہے:

عارفؔ نہ کچھ کبھی حاصل کوئی کمال
ہے دشمنی زمانے کو اہلِ ہنر کے ساتھ

یہ شعر بھی غالبؔ کے ایک شعر کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ زمانہ ان لوگوں کا دشمن ہوتا ہے جو اہلِ کمال ہوتے ہیں، یہ بھی غالبؔ کا مصرع ہے:

'ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں'

یہ مصرع یا غالبؔ کے دوسرے شعر، اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ اربابِ فکر اور اہلِ فن کی قدر نہیں کرتا۔ اس پر اظہارِ ناخوشی کرتے ہوئے عارفؔ نے یہ کہا کہ کمال

حاصل کرنا ہی بُرا ہے کہ ساری دشمنیاں تو اہلِ ہنر کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ہماری شاعری کا ایک حصہ وہ بھی ہے جو اہلِ سماج کی ذہنی کمزوریوں اور دنیادارانہ روشوں کی مذمت کرتا ہے۔

عارفؔ کی شاعری میں جو مضامین ہیں ان میں بہت کم وہ انداز ملتا ہے جسے غالبؔ کی شاعری کا اثر اور عکس کہہ سکیں۔ اس بات کا ثبوت کہ عارفؔ کے یہاں غالبؔ کی شاگردی کے زیرِ اثر غالبؔ کا رنگ آگیا تھا ان کی غزلوں سے نہیں فراہم ہوتا۔ کہیں کہیں عارفؔ اور غالبؔ کی زمینیں ضرور ہیں لیکن یہ ایک ایسی عام صورتِ حال ہے جو دوسرے شعرا کے ہاں بھی ملتی ہے لیکن غالبؔ کی طرزِ فکر یا اندازِ بیان جیسی کوئی چیز عارف کے کلام میں قطعی کہیں نہیں ملتی۔ عارفؔ کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

کچھ نظر آتے ہو عارفؔ تم ہمیں دلگیر سے
آج کیا اس جنگجو سے پھر لڑائی ہوگئی

عارفؔ، غالبؔ کے معترف سہی لیکن غالبؔ کی پیروی نہ انھوں نے کی اور نہ یہ ان کے بس کی بات تھی۔ وہ ایک مقبولِ عام طرز کو اپنانے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ غالبؔ کے طرزِ ادا کو اپنانا ایک طرف تو مشکل تھا اور دوسرے اس دور میں قبولِ عام کی سند بھی حاصل نہیں تھی، لہٰذا ان کے یہاں غالبؔ اور طرزِ غالبؔ کے لیے احترام اور اعتراف تو تھا لیکن تقلید یا پیروی کی کوئی روش نہیں۔

لُٹ کے گھر، آہوں (سے) ہے، آج ہمارا خالی
نہیں کچھ بھید (سے) یہ آپ کا آنا خالی

عارفؔ کے اس شعر کا مفہوم غالبؔ کے اس شعر میں موجود ہے:

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

عارفؔ نے اس بات کو اپنے طور پر کہا اور شعر گوئی کا جو اسلوب غالبؔ کے یہاں ملتا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالبؔ نے عارفؔ سے محبت کی لیکن ان کی ادبی اور شعری تربیت میں بہت کم حصہ لیا۔ شعر گوئی اور رنگِ سخن کے سلسلے میں عارفؔ نے غالبؔ کا اثر قبول نہیں کیا:

کس لیے پھر آرزوئے دشت پیمائی کروں
جب کہ ویراں تر بیاباں سے مرا گھر ہوگیا
(عارفؔ)

یہ مضمون غالبؔ نے بھی اپنے یہاں باندھا ہے:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
(غالبؔ)

ناخنِ فولاد سے گھڑیوں کھجاتا ہے اُسے
اتفاقاً گر کبھو زخمِ جگر کھجلائے ہے
(غالبؔ)

اس غزل کا مطلع نہیں ہے اور اس زمین میں غالبؔ کی بھی غزل ہے لیکن غالبؔ کا انداز اور طرزِ ادا اس میں نہیں جھلکتا، غالبؔ کا مصرع ہے:

مُودہ خارِ دشت پھر تلوا میرا کھجلائے ہے

غالبؔ کی غزل سے انھوں نے یہ ایک عام تاثر لیا ہو کہ ان کی غزل پر غزل کہہ دی ہو یہ تو ممکن ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ یہ مشاعرے کی غزل ہو اور مصرعِ طرح پر غالبؔ اور عارفؔ نے اپنی اپنی غزلیں کہی ہوں لیکن طرزِ غالبؔ کا عارفؔ کے یہاں کوئی تاثر نہیں پایا جاتا اور یہ ایک عجیب وغریب صورتِ حال ہے کہ غالبؔ سے ان کی قربت کے باوجود وہ غالبؔ سے بالکل متاثر نہیں دکھائی دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دور غالبؔ سے ذہنی ہم آہنگی نہیں رکھتا تھا لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ غالبؔ کے یہاں دور از کار باتیں ہیں۔ ایسی صورت میں غالبؔ سے ان کا اتفاق کرنا اور ان کے رنگ کو اپنانا ایک نہ ہونے والی بات تھی۔

اس میں اس امر کا بھی امکان ہے کہ غالبؔ ان سے ممکن ہے محبت کرتے ہوں لیکن دونوں کے درمیان تعلقِ خاطر اور ہم آہنگی کی وہ صورت نہ ہو جو بہ ظاہر کچھ بیانات کو پڑھ کر ہمارے ذہن کی سطح پر ابھرتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان رشتوں میں کشیدگی تھی، اس کی بنیاد کہاں تھی؟ اور کیوں تھی؟ یہ تو موجودہ معلومات کی روشنی

میں کہنا مشکل ہے مگر اس کا ثبوت ایک ایسے قطعۂ معذرت سے فراہم ہوتا ہے جو حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے:

''حضرت غالبؔ کو مخاطب کر کے عارفؔ نے تین قطعے کہے ہیں، پہلے قطعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی نے عارفؔ کی یہ شکایت غالبؔ سے کی کہ مرزا غالبؔ کو ان کی غیبت میں عارفؔ بُرا کہتے ہیں اپنی صفائی میں عارفؔ نے یہ قطعہ کہا ہے جس کے دو شعر ہیں:

قبلۂ جان و دل ترا فدوی — تجھے کہوے بُرا یہ طاقت ہے

اسداللہ نام ہے تیرا — اس بزرگی کی کچھ نہایت ہے''

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو'خاندانِ لوہارو کے شعرا' ص ۷۱)

یہ قطعہ ادبی اعتبار سے بہت معمولی ہے لیکن اس کا پس منظر اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ غالبؔ کے غزل نما مرثیے میں آنے والے اس شعر کا نفسیاتی پس منظر عارفؔ کے قطعے میں موجود ہے۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے خود بھی اس پر روشنی ڈالی ہے، قطعہ یہ ہے:

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی

بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

نیّر نواب ضیاء الدین احمد خاں کا تخلص ہے، عارفؔ کے ان کے درمیان اختلافات ہوں گے۔ خانگی معاملات میں یہ کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ لیکن غالبؔ سے نفرت آخر کیوں؟ معلوم ہوا کہ کچھ حقائق ایسے بھی ہیں جو پوری طرح سامنے نہیں آئے اور غالبؔ کی تقلید نہ کرنے میں ان نفسیاتی امور کو بھی دخل ہے۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے اس سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ کہی ہے:

''ایک زمانے میں نواب نیّرؔ اور نواب عارفؔ کی باہمی چشمک تھی۔
عارف کا.....شعر ہے''۔

(خاندانِ لوہارو کے شعرا، ص ۷۱)

نیّر و محو ہیں میرے دشمن — آسماں کی انھیں نیابت ہے

غالبؔ کی طبیعت شیعیت کی طرف مائل تھی، ان کی بہت سی باتوں سے اس جوشِ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جو انھیں حضرت علی اور دوسرے ائمۂ اہلِ بیت سے تھی۔ ان کی مدحیہ

شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ وہ ہے جو اہلِ بیت کے قصائد پر مشتمل ہے۔ یہ قابلِ ذکر اور لائقِ توجہ بات ہے کہ عارفؔ کے یہاں بھی ان کے بعض معاصرین نے اس امر کی نشاندہی کی ہے اور خاص طور پر ان کے قصائد سے اس رجحان کا اظہار ہوتا ہے مگر اُس کی وجہ غالبؔ نہیں ہیں بلکہ وہ خاندانی ماحول ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حمیدہ سلطان صاحبہ نے لکھا ہے:

> ''تعزیہ داری اور مجلسیں کرنا خاندانِ لوہارو میں عام تھا جب تک ریاست باقی رہی تیرہ دن تک باقاعدہ محرم میں مجلس ہوتی تھی جس میں نواب خود مع اپنے خاندان کے شرکت کرتے تھے نذر نیاز کے لیے ایک پیر صاحب الگ تعینات تھے اور ایک گاؤں کی سالانہ آمدنی اہلِ بیت کی نذر کے لیے وقف تھی''۔[1]

عارفؔ کی شاعری

عارفؔ کا کلیات بہت ضخیم ہے اور دو دواوین پر مشتمل ہے، ان دونوں دواوین میں بہت بڑی تعداد غزلوں کی ہے اس کے علاوہ انھوں نے قصائد، قطعات، مثنوی، رباعی، سلام، منقبت اور دوسری شعری اصناف میں بھی بہت کچھ لکھا، اس کی تفصیلات تو 'مخطوطے کے مشتملات' کے عنوان کے تحت آئیں گی یہاں ان کی شاعری کی خصوصیات پر ایک نظر ڈالی گئی ہے۔

عارفؔ کے یہاں کہیں کہیں مسلسل غزل کا انداز ملتا ہے 'ہلالِ عید' پر جو انھوں نے اکیس شعروں پر مشتمل غزل کہی وہ اسی طرح کی ایک غزل ہے۔ جب ردیف ہلالِ عید ہے تو اشعار کی فضا بھی وہی ہوگی۔ عارفؔ نے نظمیں نہیں لکھیں، اس زمانے تک نظم نگاری کا رواج عام نہیں ہوا تھا صرف نظیرؔ اکبرآبادی کے یہاں نظمیں ملتی ہیں مگر ان کی شاعری کے بارے میں اہلِ دہلی کی رائے اچھی نہیں تھی ایسی صورت میں عارفؔ کی غزلیہ شاعری میں جو مختلف غزلیں یکساں رنگ و آہنگ کی حامل ہیں ان کو ہم نظم نگاری سے ان کی دلچسپی کا ایک نمونہ قرار دے سکتے ہیں، اس غزل سے جو طویل نہ ہوتے ہوئے بھی آج کے نقطۂ نظر سے طویل ہے،

---

[1] 'خاندانِ لوہارو کے شعرا' حمیدہ سلطان احمد، ص ۷۱، جون ۱۹۸۱ء۔

ان کی نظمیہ شاعری کا اندازہ ہوتا ہے بشرطیکہ اس نقطۂ نظر سے اس کو دیکھا جائے۔ اس غزل کا مقطع ملاحظہ ہو:

عارفؔ مسرّت آج کی سنت ہے شاد ہو
خوش دیکھ کر ہوئے تھے پیمبر ہلالِ عید

عارفؔ کے اپنے ذہن میں یہ بات کہیں ضرور تھی کہ میرؔ اور سوؔدا دونوں غزل کے بڑے شاعر ہیں اس کے باوجود وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ ان کی اپنی شاعری ان دونوں بڑے شاعروں سے کسی سطح پر کم نہیں ہے اس لیے شاید وہ اس قسم کے شعر کہنے پر آمادہ ہوئے اور ان کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ ان کے زمانے میں ان کی شاعری کی کسی نے قدر نہیں کی۔ ناقدریِ زمانہ کی یہ شکایت اکثر شعرا کی زبانِ قلم پر آتی رہی ہے۔ عارفؔ اس معاملے میں منفرد نہیں ہیں بلکہ ایک روایت ہی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہوں جن سے عارفؔ کے احساسِ برتری اور ان کے شخصی خیالات و جذبات کا آسانی سے پتا لگایا جاسکتا ہے:

عارفؔ غزل اک اور سُنا اس سے بھی بہتر
سب آج تجھے کہتے ہیں سوؔدا کے برابر
کیا ہے کلامِ میرؔ سے میرا کلام کم؟
پر قدرداں نہیں کوئی عارفؔ ہزار حیف

عارفؔ کی غزل کا ایک اور مقطع پیش نظر ہے:

ہے تو بتائے چشمِ ملائک وہ خاکِ پاک
عارفؔ جہاں پڑے ہیں حسین و حسن کے پاؤں

یہ غزل ویسے تو غالبؔ کی زمین میں ہے اور خاص طور پر یہاں اہلِ بیت سے عقیدت کا اظہار ہے، یہ زمین اُس دور میں بہت پسند کی گئی ہوگی اسی لیے اس میں عارفؔ نے مسلسل غزلیں کہی ہیں۔ دوغزلہ، سہ غزلہ کہنے کی روایت تو دوسرے اساتذۂ سخن کے یہاں بھی پائی جاتی ہے لیکن ایک ہی زمین میں پانچ غزلیں کہنے کا ملکہ نسبتاً کم استادوں کے یہاں ملتا ہے اس اعتبار سے عارفؔ اپنے زمانے کے اساتذۂ سخن میں نہ ہونے کے باوجود استادانہ انداز رکھتے ہیں اور سیر حاصل غزلیں کہتے ہیں:

'کشتِ' امید مرا خشک اب تلک پڑا ہے
چاروں طرف سے اُٹھ کر سو بار ابر آئے

'کشت' کو عارف کے یہاں مذکر باندھا ہے۔

عارف بجا ہیں چشم ملائک میں گر رہیں
جب خاکِ پائے 'صاحب لولاک' ہو گئے

ہم سے دیکھا نہیں جاتا یہ ترا حالِ زبوں
عارف اس وقت میں ہم اور کہیں کیوں نہ ہوئے

یہ ایک اچھا اور جذباتی انداز کا سفر ہے۔ عارف جس طرح کی شاعری کرتے ہیں اس میں اس قسم کے شعر کم ہی نظر آتے ہیں۔ عارف کی شاعری دراصل ان کی مشقِ سخن سے عبارت ہے، وہ مختصر غزلیں نسبتاً کم اور اس کے مقابلے میں دامن دار (طول طویل) غزلیں زیادہ کہتے ہیں، ان کی غزل میں وہ طوالت تو نہیں ہے جو شاہ نصیر اور ذوق کے یہاں ملتی ہے مگر اختصار کی صفت سے بھی ان کی اکثر غزلیں عاری ہیں اس لیے کہ انھیں شعر کو تخلیقی حسیت میں سمونے کا اتنا خیال نہیں رہتا جتنا وہ مشقِ سخن، پُرگوئی اور زود گوئی کا خیال رکھتے ہیں، ان کے نزدیک یہی کمالِ فن ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ عارف نے اپنی شاعری میں میر اور سودا کے حوالے سے کئی شعر کہے کیوں کہ اس زمانے کے شاعر عام طور پر پہلے زمانے کے اساتذہ کے ساتھ اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور عارف نے بھی اسی سنت کی پیروی کی اور میر و مرزا کے حوالے سے بعض ایسے اشعار کہے جن سے ان کے اس ادبی رویے کی توثیق ہوتی ہے۔ ان کا ایک قابلِ لحاظ مقطع ہے جس سے ان کے ادبی نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے:

جو، اب ہے، تھی سدا سے یہی وضع آپ کی
دنیا کے بارے تم کو بھی عارف ہوا لگی

جس زمانے میں عارف شاعری کر رہے تھے اس طرح کی غزلوں کا رواج بہت تھا جن میں مشکل اور بھاری ردیف وقافیے آتے تھے۔ ان کے نانا نواب الٰہی بخش خاں معروف کے یہاں اس طرح کی غزلیں زیادہ پائی جاتی ہیں اور یہ شاہ نصیر کا رنگ بھی ہے تیز

'کشتِ' امید مرا خشک اب تلک پڑا ہے
چاروں طرف سے اُٹھ کر سو بار ابر آئے

'کشت' کو عارفؔ کے یہاں مذکر باندھا ہے۔

عارفؔ بجا ہیں چشمِ ملائک میں گر رہیں
جب خاکِ پائے 'صاحب لولاک' ہو گئے

ہم سے دیکھا نہیں جاتا یہ ترا حالِ زبوں
عارفؔ اس وقت میں ہم اور کہیں کیوں نہ ہوئے

یہ ایک اچھا اور جذباتی انداز کا سفر ہے۔ عارفؔ جس طرح کی شاعری کرتے ہیں اس میں اس قسم کے شعر کم ہی نظر آتے ہیں۔ عارفؔ کی شاعری دراصل ان کی مشقِ سخن سے عبارت ہے، وہ مختصر غزلیں نسبتاً کم اور اس کے مقابلے میں دامن دار (طول طویل) غزلیں زیادہ کہتے ہیں، ان کی غزل میں وہ طوالت تو نہیں ہے جو شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ کے یہاں ملتی ہے مگر اختصار کی صفت سے بھی ان کی اکثر غزلیں عاری ہیں اس لیے کہ انھیں شعر کو تخلیقی حسیت میں سمونے کا اتنا خیال نہیں رہتا جتنا وہ مشقِ سخن، پُر گوئی اور زود گوئی کا خیال رکھتے ہیں، ان کے نزدیک یہی کمالِ فن ہے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ عارفؔ نے اپنی شاعری میں میرؔ اور سوداؔ کے حوالے سے کئی شعر کہے کیوں کہ اس زمانے کے شاعر عام طور پر پہلے زمانے کے اساتذہ کے ساتھ اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور عارفؔ نے بھی اسی سنت کی پیروی کی اور میرؔ و مرزاؔ کے حوالے سے بعض ایسے اشعار کہے جن سے ان کے اس ادبی رویے کی توثیق ہوتی ہے۔ ان کا ایک قابلِ لحاظ مقطع ہے جس سے ان کے ادبی نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے:

جو، اب ہے، تھی سدا سے یہی وضع آپ کی
دنیا کے بارے تم کو بھی عارفؔ ہوا لگی

جس زمانے میں عارفؔ شاعری کر رہے تھے اس طرح کی غزلوں کا رواج بہت تھا جن میں مشکل اور بھاری ردیف و قافیے آتے تھے۔ ان کے نانا نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کے یہاں اس طرح کی غزلیں زیادہ پائی جاتی ہیں اور یہ شاہ نصیرؔ کا رنگ بھی ہے نیز

غالبؔ بھی گاہے گاہے اس طرح کی غزلیں لکھتے تھے۔ غالبؔ کے یہاں طول طویل غزلیں نہیں ملتیں مگر اس زمانے کے شعرا کے یہاں ان کے نمونے مل جاتے ہیں یہاں تک کہ پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ اور ستر ستر شعروں کی غزلیں بھی اس زمانے کے شعرا اور اساتذۂ سخن کے دواوین میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ تمام تمام رات مشاعرے ہوتے تھے اور غزلیں پڑھی، سنی جاتی تھیں اور اس کو استادانہ کمال تصور کیا جاتا تھا کہ ایک شاعر کسی بحر میں ردیف و قافیے کی پابندی کے ساتھ کتنے شعر کہہ سکتا ہے۔ یہاں شعر گوئی کا معیار نہ جذبات تھے اور نہ احساسات کی ترجمانی ہی تھی، جن باتوں کو ہم آج تخلیقی حسیت کے تحت رکھتے ہیں وہ بھی عام طور پر تنقید شعر کی بنیاد نہیں بنتی تھیں بلکہ شاعر کا زورِ کلام روایت کی پابندی کے ساتھ صحیح زبان کا استعمال محاورہ اور روزمرہ کی پیروی، معیارِ سخن کے طور پر پیشِ نظر رکھے جاتے تھے اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ شعرا کے دواوین بہت ضخیم ہیں اور کلیاتِ میرؔ اور مصحفیؔ کی طرح کئی کئی دیوان شامل ہیں۔ انتخاب اگر یہ لوگ بھی کرتے تھے تو بیشتر ان کے پیشِ نظر زبان اور محاورے کی درستی کا معیار ہوتا تھا۔ اعلا درجے کے ایسے شعر نہیں جو ان کی تخلیقی حسیت کے آئینہ دار ہوں، ظاہر ہے کہ جس زمانے میں طول طویل قصے لکھے جارہے ہوں اور قصہ در قصہ داستان در داستان زورِ بیان کا معیار ہو شاعر مختصر کلام یا پھر منتخب اشعار پر قناعت نہیں کرسکتا۔

روح القدس کو غم ہے نہ بُت خانہ ہو کہیں
جس جا بدن پہ نقش ہے تیرے حصیر کا

یہ شعر اُسی مشکل زمین سے تعلق رکھتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ روح القدس کو یہ خیال رہتا ہے کہ کہیں یہ بت خانہ نہ سمجھا جائے تیرے مبارک بدن پر جو حصیر (بستر/ بوریا) کے نقش بن گئے ہیں یعنی تو نے بوریے پر آرام کیا ہے اور بدن کی نزاکت کے باعث بوریے کے نشان تیرے تن پر آگئے ہیں۔

لامکاں تک نظر آوے مجھے پھر تو عارفؔ
ہووے گر خاک درِ شاہِ خراساں پیدا

'شاہِ خراساں' یہاں حضرت علی کے لیے آیا ہے۔ عارفؔ کی شاعری کی ایک یہ خصوصیت بھی اس دورِ شاعری سے تعلق رکھتی ہے کہ ایک ہی ردیف کے ساتھ ایک سے زیادہ غزلیں کہی جاتی ہیں۔ غزل در غزل میں کہیں قافیہ بدل جاتا ہے اور کہیں وہی قافیہ رہتا ہے۔

جو گھر میں میرے آنا ہو تو وعدہ مہرباں کیجیے
گھٹا جاتا ہے دم چُپ سے، نہیں کیجیے کہ ہاں کیجیے

یہ غزل بارہ شعروں پر مشتمل ہے، لیکن اس میں کوئی مقطع نہیں ہے بلکہ اس آخری شعر کے بعد جو ذیل میں دیا گیا ہے ایک اور بارہ شعروں پر مشتمل غزل اسی زمین میں شروع ہو جاتی ہے۔

نہ چشم سلطنت رکھیے نہ امیدِ جناں کیجیے
یہی بہتر ہے سب باتوں سے ترکِ دو جہاں کیجیے

اس کا مقطع یہ ہے (دوسری غزل):

ہمیں تو آہ بھی کرنی ہے مشکل ان دنوں عارف
جگر کے ٹکڑے ہوتے ہیں اگر شور و فغاں کیجیے
جب سے پیشانی پہ قشقہ کھینچ کر بیٹھے ہیں آپ
آپ کے چہرے پہ عارف کیا برستا نور ہے

یہ مقطع اگرچہ کوئی خاص نہیں ہے، لیکن اس سے اردو شاعری کی اس روایت پر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ یہ زبان سیکولر زبان ہے اور اس کے شاعر ہندوستانی کلچر سے محبت کرتے رہے ہیں۔

اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کسی مذہب کی زبان نہیں رہی یہ ایک کلچر کی زبان ہے، اس کلچر کی جسے ہم مشترک تہذیب اور متحدہ قومیت کی علامت تصور کرتے ہیں۔
اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عارف نے اپنے زمانے اور اس سے پیشتر دور کے اساتذۂ سخن کو اپنے مطالعے میں رکھا اور ان کے فکری انداز کا اثر بھی قبول کیا، یہ الگ بات ہے کہ وہ ان کے شعری اور شعوری سلسلۂ سخن کی پیروی کرتے نظر نہیں آتے یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے شعروں کو عارف کے زمانے میں مختلف اربابِ ذوق اور اہلِ سخن موقع بہ موقع دُہراتے رہتے ہوں:

لے کر دیارِ عشق سے ہم داغِ غم چلے
یہ شہر وہ نہیں ہے کہ جس جا دِرم چلے

اس زمین میں بغیر مقطع کے دو غزلیں شامل ہیں اور دوسری غزل کے مطلعے کو مقطعے کے انداز سے جدول میں لکھا گیا ہے، وہ مطلع یہ ہے:

با آہِ سرد و بادلِ پُردرد و غم چلے
دشمن کو بھی نصیب نہ ہو جیسے ہم چلے

یہ اندازِ نگارش، غزل مکمل کرنے کے بعد کی سوچ بھی ہوسکتا ہے اور ممکن ہے کہ شاعر کی نگاہ میں یہ فنکارانہ اندازِ نگارش ہو اور اس کو بھی اس نے تحریر و نگارش کا ایک تجربہ قرار دیا ہو۔

کون کہہ سکتا ہے یاں میرے برابر ریختہ
شک نہیں عارفؔ کہ ہے بس یہ زباں میرے لیے

اہلِ دہلی اپنی زبان پر فخر کرتے تھے، اپنے محاورے کو ترجیح دیتے تھے اور دوسروں کے سامنے بے تکلف اس کا اظہار کرتے تھے یہاں تک کہ پھر یہی روش انھوں نے لکھنؤ کے مقابلے میں بھی اختیار کی اور لکھنؤ نے رفتہ رفتہ اپنی زبان اور اپنے محاوروں کو قابلِ ترجیح تصور کیا اور اس کی دعویداری ان کے یہاں بھی آگئی کہ ان کا محاورہ بہتر ہے۔ یہ سوچ اہلِ دہلی میں اہلِ دکن کے مقابلے میں پیدا ہوئی تھی اور فارسی والے بھی جس طرح اردو والوں کی فارسی کو اس لیے سند نہیں مانتے تھے کہ وہ اہلِ زبان نہیں ہیں۔ دلّی والے بھی باہر والوں کی تضحیک پر آمادہ رہتے تھے، یہ رویہ ہمیں داغؔ اور شاگردانِ داغؔ تک ملتا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری اور دلّی کی شاعری پر بڑی بحثیں ہوئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب ناسخؔ کا دیوان یا ناسخؔ کی غزلیں دلّی پہنچیں تو غالبؔ جیسے شاعر نے بھی ناسخؔ کے رنگ کو قبول کیا۔ انشاؔ اور مصحفیؔ بھی لکھنؤ میں جا بسے اور لکھنؤ نے ان کا خیر مقدم کیا اور انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ لکھنؤ کی شاعری کا کوئی تصور انشاؔ، مصحفیؔ، میر حسنؔ (ان کے خانوادہ میر انیسؔ وغیرہ) سوداؔ اور میرؔ کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

عارفؔ نے بہرحال اسی رویّے کا اظہار کیا اور یہ شعر کہا کہ اے عارفؔ زبان اور محاورے کے ماہر اور دانائے راز تم ہی ہو:

بزمِ جاناں کی نہ پہلی سی وہ رنگت پائی
اور ہی لوگ ہیں کچھ اور ہی صحبت پائی

یہ شعر اس زمانے کی معاشرتی زندگی پر روشنی ڈالتا ہے کہ ہم نشینی، ذہنی قربت اور دوستی آپس کی صحبتوں سے کیا رشتہ رکھتی تھی آج اس قسم کی صحبتوں کا کوئی ذکر نہیں آتا۔

عارفؔ کبھو میں نام بھی لیتا نہ عشق کا
معلوم اس کی ہوتی جو کچھ انتہا مجھے

بندشِ زبان کے معاملے میں عارفؔ کے ہاں وہ حسن نہیں جو اہلِ لکھنؤ کا خاصہ ہے۔ وہ خاصی ڈھیلی ڈھالی زبان استعمال کرتے ہیں، اگرچہ روانی ان کے کلام میں بھی ہے۔ تاہم وہ طرزِ ادا کی ندرت اور جدید اسلوب کا اظہار اپنے اشعار میں اہلِ لکھنؤ کی طرح پھر بھی نہیں کر پاتے، یہ تو خیر الگ بات ہے مگر ان کے یہاں کبھو کا استعمال زیادہ ملتا ہے کبھی کے مقابلے میں یہ لفظ دہلی کی زبان میں ایک زمانے میں بے شک رائج رہا، عہدِ غالبؔ میں اس کی مثال کہیں خال خال ہی ملتی ہوگی۔ عارفؔ کے یہاں یہ نسبتاً زیادہ ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے اس تک ہماری رسائی اب کیسے ہو۔ عارفؔ کے اسلوب پر ایسا کچھ لکھا نہیں گیا اور جو کچھ لکھا گیا اس میں ان کی زبان پر کوئی تنقیدی اور تحقیقی گفتگو نہیں ہوئی روایتی طور پر انھیں غالبؔ سے ذہنی وابستگی رکھنے والا شاعر سمجھ لیا گیا اور اس کے بعد مزید سوچنے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی۔

جب دادِ سخن ملتی تمھیں حضرتِ عارفؔ
سنتا جو غزل آج کو یہ میرؔ تمھاری

غالبؔ کے زمانے میں میرؔ کو گزرے ہوئے اچھا خاصا وقت بیت چکا تھا پھر بھی میرؔ کی شاعری کا ذہنوں پر اثر تھا اور ان کا ذکر شعرائے دلّی کی زبان پر سوداؔ کے مقابلے میں زیادہ آتا تھا۔

جا تو بھی تو بازار کو ہولے ہولے
لوٹ ہر ایک خریدار کو ہولے ہولے

'ہولے ہولے' کے معنی آہستہ آہستہ کے ہیں، شہروں میں تقریباً یہ لفظ اب متروک الاستعمال ہے مگر عارفؔ نے اسے استعمال کیا اور اس سے اپنی غزل کے اشعار میں روزمرہ کے طور پر استعمال کیا ہو کہ یہ غزل کی ردیف ہے اور ہولے ہولے کی تکرار اشعار دیدار، تکوار جیسے قافیوں کے ساتھ سننے میں بھلی لگتی ہے۔

عارفؔ کا اپنے دورِ شاعری میں بعض اساتذہ کی طرح اپنا کوئی خاص لہجہ نہیں ہے لیکن ایسی ردیفوں کے ساتھ جب ہم عارفؔ کا کلام پڑھتے ہیں تو اس میں لب و لہجے کی جو کیفیت ملتی ہے وہ دوسروں سے ممتاز ضرور نظر آتی ہے اس لیے کہ مومنؔ، غالبؔ اور ذوقؔ کی غزلیات میں یہ اندازِ شعر گوئی اور طرزِ سخن سرائی موجود نہیں، ظفرؔ کے یہاں ایسی کوئی مثال ضرور مل جائے گی۔

مطلعِ اول:

کیوں آئینے میں دیکھا تو نے جمال اپنا
دیکھا تو خیر دیکھا پر دل سنبھال اپنا

مطلعِ ثانی:

اُس کا ہو جب تصور کب ہو خیال اپنا
کیسی مصیبت اپنی کیسا خیال اپنا[1]

مطلعِ ثالث:

کھویا غمِ رفاقت دیکھو کمال اپنا
بہکا دیا ہے سب کو دکھلا کے حال اپنا

مقطع:

خرمن تو دیکھ لیتے بجلی بلا سے گرتی
ہونا تھا کھیت عارفؔ یوں پائمال اپنا

مطلعِ رابع:

دن دیکھے تیری صورت جینا وبال اپنا
دن آئے تیرے ظالم مرنا محال اپنا

اس غزل میں چار مطلعے آئے، ان چار مطلعوں کو یہاں اسی لیے پیش کر دیا گیا کہ غزل نگاری میں ایک سے زیادہ مطلعے پیش کرنے کی شاعرانہ کوشش کے معنی سمجھ میں آ جائیں۔

اس کے بعد کی غزل میں بھی تین مطلعے آئے ہیں، یہ غزل بھی کافی طویل ہے اور اس میں تین مطلعوں کے علاوہ مقطع کو شامل کرتے ہوئے ۲۷ شعر ہیں، اس سے پتا چلتا ہے کہ عارفؔ اپنے زمانے کے استادانہ رویّے کے پابند بھی ہیں اور طول طویل غزلوں سے ان کو بھی دلچسپی ہے:

عارفؔ ابھی صفحے پہ قلم سجدہ فشاں ہو
گر قافیہ تحریر کروں شیرِ خدا کا

---

[1] شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیے (خیال) کی تکرار ہے، یہ عیب ہے جسے ایطا کہتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ 'شیرِ خدا' حضرت علی کا لقب ہے، ظاہر ہے یہ شعر حضرت علی کی ذاتِ والا سے عارف کی عقیدت کا آئینہ دار ہے۔ غالب کا مسلک بھی یہی تھا اس اعتبار سے دونوں کا مسلک ایک دوسرے سے قریب ہے۔

بیمار کو کیا تیرے اثر آب و ہوا کا
مشکل کہیں آسان ہو (ہے) وقت دعا کا

وقت دعا کا ذکر مشکلات کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ حالؔی کے اس شعر سے مزید اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ وقتِ دعا بطورِ محاورہ استعمال ہوتا تھا۔ حالؔی کا شعر ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رُسُل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

اس غزل (وقت دعا کا) میں بھی ایک دو نہیں بلکہ پانچ مطلعے آئے ہیں، یہ پنجتن پاک کی مناسبت سے بھی ہو سکتے ہیں لیکن ان میں صرف دو مطلعے براہِ راست حضرت علی کی شان میں ہیں یا پھر مطقعے میں حضرات آلِ عباس کا یہاں ذکر آیا ہے۔

ہو گیا ہے رہ کے زنگ آلود ناوک یار کا
زخمِ دل پر کیوں گماں ہے مرہمِ زنگار کا

اس غزل میں بھی پانچ مطلعے آئے ہیں اور چھبیس (۲۶) شعروں کے بعد پھر ایک نیا مطلع آ گیا۔ اور مطلع نگاری کا سلسلہ پانچ مطلعوں تک جاری رہا اور چھٹے مطلعے سے چونتیس اشعار کی ایک اور غزل شروع ہو جاتی ہے اور اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

جی میں آتا ہے کہ کیجیے ایک دو مطلع رقم
یک قلم جس میں بیاں ہو خوبیِ دلدار کا

اور پھر ایک نیا مطلع لکھ کر سولہ شعروں کی ایک اور غزل رقم کی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں طول طویل غزلیں لکھنے کا کس حد تک رواج تھا کہ ایک ہی زمین میں دو غزلہ، سہ غزلہ نہیں اُس سے آگے سات، آٹھ غزل تک برابر شعر کہتے رہتے تھے۔

پاؤں جس دم اُس کے سونگھے روح تازہ ہو گئی
کیا کہوں سچ مچ ہیں عارف یار کے پابوس گل

اس مقطعے پر جو غزل ختم ہوتی ہے وہ سترہ شعروں پر مشتمل ہے، اس کے بعد غزلِ ثانی کے

عنوان سے ۱۹ شعروں کی ایک غزل سپردِ قلم کی گئی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

مجھ کو دکھلا دو چار کے پابوس گل
ہیں تو رنگیں ہو کے میرے یار کے پابوس گل

اس کے بعد آٹھ، دو دو شعر کے قطعے آئے ہیں جو اسی زمین اور اسی ردیف و قافیے میں ہیں، آخر کا شعر یہ ہے:

گر نہ ہوتے پاؤں تو کس رنگ سے آتی بہار
نو بہارِ گلشنِ گلزار کے پابوس گل

لذّتِ درد سے محفوظ وہ ناکام نہیں
جس پہ بیتابیِ دل باعثِ آرام نہیں

یہ غزل بتیس شعروں پر مشتمل ہے اور اس دورِ شعر گوئی سے اپنی کثرتِ اشعار کے پیشِ نظر زیادہ مشابہ ہے کہ وہ لوگ ایک ہی قافیہ اور ردیف پر مسلسل غزلیں لکھتے تھے۔ یہاں بھی بتیس شعر پانچ غزلوں کا تقاضا کرتے ہیں، بہرحال یہ اس دور کی روش ہے۔

وہ پوچھتے ہیں جو جم کے برسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
کہ لرزے رورو ہے کس کے ڈر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

یہ شاہ نصیر کی زمین ہے جو اپنی مخصوص ساخت کے لحاظ سے اُس دورِ شاعری کے اسلوب کی نمائندگی کرتی ہے۔

دوہرے ہوئے جو شرم سے وہ پیچ و تاب میں
حسن ان کا ہوگیا ہے دوبالا حجاب میں

اس زمین میں ناسخؔ کا سہ غزلہ ہے۔ غالبؔ کا بھی دوغزلہ ہے اور یہ شاید کسی طرحی مشاعرے کی غزل ہوگی، اس میں عارفؔ نے دوغزلہ لکھا ہے اور دوسری غزل کا مطلع وہ ہے جس میں 'بوتراب' کا قافیہ آیا ہے اسے غالبؔ نے مقطعے میں استعمال کیا تھا، عارفؔ کا مطلعِ ثانی یہ ہے:

کیا ڈھونڈتا ہوں مجمعِ یوم الحساب میں
دامن عیاں ہے پیرہنِ بوتراب میں

ایک اور مقطعے میں عارفؔ صوبۂ پنجاب کے تاریخی واقعے کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

وجہ کیا ہے جو وہ لے کر تجھے دے دیں عارفؔ
کشورِ دل ہے کوئی صوبۂ پنجاب نہیں

صوبۂ پنجاب اس وقت تک نہایت اہم صوبوں میں تھا، انگریزوں نے رنجیت سنگھ کے جانشینوں سے جنگ کر کے اسے لے لیا اور پھر صلح کر لی مگر جلد ہی وہ صلح کا معاہدہ ٹوٹ گیا یہی وہ صورتِ حال ہے جس کی طرف عارفؔ کے اس شعر میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ اس اعتبار سے ایک دلچسپ بات ہے کہ عارفؔ جو بیشتر روایتی شاعری کرتے ہیں، انھوں نے اپنے اس مقطعے میں روایت سے ہٹ کر ایک سیاسی واقعے پر اپنی سوچ اور ذہنی ردِ عمل کا اظہار کیا۔ اس سے ہم اس نتیجے پر بھی پہنچ سکتے ہیں کہ شاعری کا مطالعہ ایک عہد کے شعر و شعور کی مختلف جہتوں کو اپنے دائرۂ فکر و نظر میں سمیٹ سکتا ہے۔

جبہہ سا دیکھیے جبریل کو جس جا عارفؔ
نہیں کچھ شک وہ درِ آلِ عبا ہوتا ہے
کھودنے گھر وہ مرا آئیں تو آئیں عارفؔ
لے گئے فرش تلک کل تو اٹھا کر گھر سے

شعر اپنی زبان کے اعتبار سے خوبصورت نہیں ہے خاص طور پر کھودنے کا لفظ جو شروع ہی میں آیا ہے اب اس کو کیا کیا جائے کہ خود غالبؔ نے بھی اس لفظ کو اپنی دو غزلوں میں بے تکلف استعمال کیا ہے، بہرحال اس سے ایک تاریخی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ قدیم زمانے کے حملہ آور دولت اور زر و زیور لوٹنے کے لیے گھر کی دیواریں اور فرش کھود ڈالتے تھے۔ میرؔ نے اس طرح کے واقعات اپنے یہاں قلم بند کیے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ انیسویں صدی تک ایسا ہوتا رہا ہے۔ غلام قادر روہیلہ نے لال قلعے کے مکانات کھدوا کر زیورات اور دفینے حاصل کیے تھے۔

کس کو اک دم کا بھروسہ ہے کہ مانند حباب
بحرِ ہستی میں اِدھر آئے اُدھر بیٹھ گئے

جہاں تک خیال کا سوال ہے اس میں کوئی خاص ندرت نہیں، زندگی کے متعلق یہ خیال بہت

عام ہے، اور ہر انسان خود کو اس تجربے سے ہم کنار سمجھتا ہے کہ یہ زندگی تو پانی کا بلبلا ہے لیکن عارف نے اسے جس انداز اور اسلوب سے پیش کیا ہے اس میں ایک تاثر ضرور جاگتا ہے اور دوسرا مصرعٔ بہت برملا ہے بحرِ ہستی میں اِدھر آئے اُدھر بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کا محاورہ مکان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے کہ پوری بلڈنگ بیٹھ گئی اور اِس کے دل پر نقش بیٹھ گیا۔ اس کے معنی جمنے کے ہیں لیکن حباب کے ساتھ بیٹھنے کا تصور آتا ہے تو اس سے زندگی کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔

اس بات کو میر نے زیادہ موثر ڈھنگ سے بیان کیا ہے:

نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں ڈوب گیا
کہے تو میر بھی اک بلبلہ تھا پانی کا
(میر)

پھرتا ہوں ساتھ گھر لیے خانہ بدوش ہوں
جب تک نہ میں ملوں تو برا کس کو گھر ملے

نیا شعر ہے، غالب کی زمین میں ہے۔ اور خانہ بدوشی کے مضامین تو اردو شاعری یا فارسی یا ہندی میں ملیں گے لیکن اس نئے پہلو کے ساتھ کہ میں تمہیں ملوں گا تو میرا گھر کیسے ملے گا کہ میں تو خانہ بدوش ہوں یہ بہ گمانِ غالب نیا شعر ہے:

کیا تھا وعدہ لے آنے کا محو نے عارف
تمام روز مجھے خوب راہ دکھلائی

محو، عارف کے دوستوں میں ہیں۔ غالب نے قلعے کے مشاعروں کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں محو کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ ان کو لینے آتے تھے اس معنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عارف نے بعض مواقع پر اپنے دوستوں کا بھی ذکر کیا ہے جیسا کہ اس موقع پر محو کا ذکر آیا ہے جو ان کے عزیز بھی تھے۔

سر سید نے 'آثار الصنادید' میں اپنے زمانے کے اہلِ کمال کا ذکر کیا تو اس میں زین العابدین خاں عارف کا ذکرِ خیر بھی شامل ہوا۔ ممکن ہے اس طرح کے تراجم تبصروں یا تذکروں میں مولوی امام بخش صہبائی نے بھی ان کو مدد دی ہو جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تاریخی عمارات کے کتبوں کو پڑھنے میں تو سر سید کے ساتھ رہتے ہی تھے ہم آج ان الفاظ کو

تنقید یا تبصرے اور تجزیے کے ذیل میں بے تکلف تو نہیں رکھ سکتے لیکن یہ بات ضرور ذہن میں رکھ سکتے ہیں کہ سرسیّد کی زبانِ قلم پر ان، کے لیے اس طرح کے فقرے آئے تھے:

''نواب زین العابدی خاں عارفؔ تخلص خلفِ رشید نواب غلام حسین خاں بہادر ابن شرف الدولہ نواب فیض اللہ بیگ خاں بہادر سہراب جنگ مرزا اسداللہ خاں غالب کی خدمت میں مشقِ سخن بہم پہنچائی ہے ...... اور فی الحقیقت اس فن میں وہ کمال حاصل کیا کہ شعرائے زمانہ قدیم میں میرؔ و سوداؔ اور قائمؔ و کلیمؔ اگر اس زمانے میں ہوتے تو بے شک اس زبدۂ اہلِ کمال کے سامنے زانوے شاگردی تہ کرتے غزل وہ کہ ناز و انداز معشوقوں کا ہر نکتے پر جان فدا کرتا ہے اور قصائد وہ کہ جاہ و جلال سلاطین کا ہر لفظ پر نثار ہوتا ہے جب مضامین عاشقانہ غزل میں خرچ ہوتے ہیں، ہر دائرہ کے ذہن سے آہ و نالہ آسمان تک پہنچتا ہے اور جب وصفِ معشوق اس میں ادا ہوتا ہے تو مداتِ حرف سے اشارۂ ابرو اور چشم صاد سے غمزۂ دل جو ٹپکتا ہے....''۔

(آثار الصنادید، سرسیّد احمد خاں، مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم، جلد دوم، ص ۱۵۵)

''......فی الحقیقت کمال کی علامت اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ شاگرد پر استاد کو ناز ہے اور کیوں نہ ہو کہ ان کی وضع جدید نے اسلاف کی کہنہ طرزوں کو آب عرق نے دھویا۔ اور مضامینِ بیگانہ نے طبیعت اہلِ علم کو ان طرزوں سے مطلقاً آشنا کر دیا..... اب انھیں دو کلمے پر اکتفا کر کر چند شعر لکھتا ہوں تا کہ حقیقت ان کے کمال و ہنر کی اہلِ ہنر پر واضح ہو جاوے''۔[1]

غالبؔ نے ان کو بیٹا بنایا تھا اور ان کی تعریف میں فارسی میں ایک قطع انشا کیا تھا جس

---

[1] آثار الصنادید، سرسیّد احمد، جلد دوم، صفحہ ۱۶۰، حاشیہ: اس عبارت کے بارے میں کمال احمد صدیقی کا خیال ہے کہ یہ سرسیّد نہیں لکھ سکتے تھے کیوں کہ یہ اسلوب ان کا نہیں ہے اور سرسیّد کے خیالات سے بھی اس کی مطابقت نہیں ہے۔ بجا طور پر شک کیا جا سکتا ہے کہ یہ انشا پردازی امام بخش صہبائی کی ہے۔

میں انھیں اپنے گھر کی، اپنے خاندان کی شمع کہا تھا۔ اور اس طرح ان پر گویا ناز کیا۔ ممکن ہے استاد شاگرد میں کسی بات پر اختلاف بھی رہا ہو، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ اور بیگم غالب نواب زین العابدین خاں عارف کو بہت چاہتے تھے۔

غالبؔ کی طرح ان کا دیوان مختصر نہیں ہے اس کا کوئی اچھا انتخاب بھی شاید کبھی شائع نہیں ہوا۔ مگر سرسید اور صہبائی نے ان کے اشعار کا جو انتخاب کیا ہے۔ اس سے بہر حال یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ اشعار جس اندازِ نظر کے ترجمان ہیں اور جذبہ و احساس کے جس رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں وہ سرسیّد اور صہبائی دونوں کو پسند تھے جب کہ سرسیّد جدید ذہن کے آدمی تھے اور یہ ایک معنی میں نئی تنقید کے بانی اور مولانا امام بخش صہبائی استادانہ طرزِ فکر کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ صاحبِ علم و تحقیق تھے اور ادبیاتِ قدیم پر گہری نظر رکھتے تھے یہ اشعار ایک طرح سے ان دونوں کے اپنے اپنے دائرے کے ماہر ادیبوں کی نگاہِ انتخاب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اشعار کی کل تعداد ۲۵ ہے اور ان میں جن حروفِ تہجی کے ساتھ شعر آئے ہیں وہ یہ ہیں: ''الف، ت، ح، د، ہائے مجہول'' یہ اشعار عارفؔ کے زمانے کی شاعری، اس دور کے ادبی شعور، شاعرانہ محفلوں کے رنگ و آہنگ میں کن باتوں کو اہمیت حاصل تھی اور مشاعروں میں شرکت کرنے والے اپنا کلام پیش کرنے والے کن باتوں کا خیال رکھتے تھے اور ان سے بے اختیار دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔ بعض اشعار عارفؔ کی شوخیِ طبع کا اظہار ہیں اور بعض ان کے شوق اور خاص طرح کے ادبی ذوق کو پیش کرتے ہیں، مثال کے طور پر کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ آئے سامنے میرے اگر نہیں آتا
مجھے تو اُس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

یہ عاشقانہ رنگ کا شعر ہے مگر اس میں جو والہانہ کیفیت ہے وہ روایتی سطح پر عاشقانہ شاعری کا حصہ نہیں ہوتی یہ رنگِ سخن غالبؔ کے اسلوب کے بجائے مومنؔ، داغؔ دہلوی کے اسلوب کے قریب ہے اس کا سامنے نہ آنا ایک بات ہے اور پردہ نشیں عورت کے ذکر میں اُس کی طرف اشارہ کوئی نئی بات بھی نہیں بہت سے شعرا کے یہاں یہ ذکرِ جمیل مل جائے گا لیکن یہ کہنا بات کی حدوں کو بہت آگے بڑھا دیتا ہے کہ میں تو اس کے علاوہ کچھ دیکھتا ہی نہیں ہوں یہ عشق مجازی کو بھی پیش کرتا ہے اور عشقِ حقیقی کو بھی، اقبالؔ نے اپنی مشہور غزل میں کہا تھا:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے میری جبینِ نیاز میں

یہاں حقیقتِ منتظر جیسا کوئی فلسفیانہ لفظ نہیں ہے لباسِ مجاز جیسی کوئی کیفیت بھی نہیں لیکن یہ کیا کم ہے کہ وہ میرے سامنے نہیں آتا نہ آئے۔ میں تو صرف اسی کو دیکھتا ہوں یہ جذباتی سطح پر کس حد تک بلند ہے اور اس میں مضمون کی بالیدگی اسے کس درجہ اعلیٰ مقام تک پہنچاتی ہے اس کا احساس اس جملے کی بے تکلفی، سادگی اور سلاست کے ساتھ جذبے کی غیر معمولی شدت سے ہوتا ہے:

سخت شرمائے، میں اتنا نہ سمجھتا تھا اُنھیں
چھیڑنا تھا تو کوئی شکوۂ بے جا کرتا

اس طرح کے لمحے جب معشوق اور عاشق دونوں کے کردار کی انفرادیت شعر کے پردے میں جھلکنے لگے، کم ہی آتی ہیں۔

گر ازل میں مجھ کو دیتے مانگنے کا اختیار
خضر کی عمر اور میخانے کی خدمت مانگتا

یہ شعر مانگنے کی ردیف کے ساتھ ایک دلآویز شعر ہے، خضر کی عمر مانگنا اپنے طور پر ایک بڑی تمنا ہے لیکن جو نئی بات شاعر نے کہی ہے وہ میخانے کی خدمت ہے۔ میخانے کا خدمت گزار ہونا ہر ایک کی قسمت میں کہاں ہوتا ہے۔ اسی بات کو ہم کسی اور مفہوم میں بھی لے سکتے ہیں لیکن میخانے کی خدمت مانگنا جیسا فقرہ ہر موقع پر اپنے خوبصورت معنی نہیں دیتا۔ یہاں میخانہ ایک علامتی لفظ ہے۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو ریا سے پاک ہے۔ یہ شعر تصوف کا بھی سمجھا جاسکتا ہے اس صورت میں میخانہ بے ریاؤں کی بستی ہے۔ اس سے مراد ایسا کوئی بھی ادارہ، ایسی جگہ، ایسا ماحول ہوسکتا ہے جو آدمی کی تمناؤں کا حصہ ہو اور اس سے گزر کر وہ تمنا کہیں پوری نہیں ہوسکتی ہو:

عارفؔ شراب بہر صبوحی نہیں نصیب
مقبول ہو تو کیا ہو ہماری دعائے صبح

شراب، ساقی اور محبوب کے ساتھ کچھ لطیف خیالات بھی وابستہ ہوتے ہیں اور وہی کچھ خاص لطف دیتے ہیں، یہاں عارف نے عجیب شوخی سے کام لیا ہے کہ صبح کی دعا قبول ہوتی ہے،

بے شک ہوتی ہوگی لیکن ہم جیسوں کی نہیں جسے صبوحی کا ایک گھونٹ بھی نصیب نہیں ہوتا تو حرف دعائے صبح کہاں سے قبولیت پائے۔ وہ قبول ہوتا تو کیا صبوحی نصیب نہیں ہوتی۔

مومنؔ کی شاعری میں ایک خاص وصف ہے اور وہ ہے مکرِ شاعرانہ یعنی لطیف پردہ داری کے ساتھ کوئی بات کہی جائے، یہاں بھی یہی ہورہا ہے اور یہ رنگ عارفؔ کی شاعری کا ایک خاص رنگ ہے جو ان کو مومنؔ سے قریب لاتا ہے۔ غالبؔ کی طرح انھیں حکیمانہ خیالات سے دلچسپی ضرور ہے مگر ان کی طبیعت شوخیٔ فکر کے معاملے میں غالبؔ سے زیادہ مومنؔ کے رنگِ سخن کی طرف مائل نظر آتی ہے۔ شوخیٔ فکر کا یہ انداز بھی دیکھیے:

اسی انداز پہ ٹھہرے جو قیامت آئے
ہے خدا کو بھی کہیں کیا تری رفتار پسند

اس زمانے کی ادبی محققوں میں شعر گوئی کا یہ انداز پسند کیا جاتا تھا اس لیے بے تکلف دوستوں کی محفلیں ہوتی تھیں اور شعر و شاعری، لطفِ محبت کے لیے کی جاتی تھی وہ کوئی دانشورانہ گفتگو کا ماحول نہیں ہوتا تھا۔

ان کے آنے کی جنازے پہ، توقع کس کو
وہم کرتے ہیں جو آتے ہوئے بیمار کے پاس

یہ اُس زمانے کی عوام پسند شاعری ہے جس کا زیادہ پُرکشش رنگ اور انداز ہمیں داغؔ کے یہاں ملتا ہے۔ بیمار پُرسی ہماری اخلاقیات کا تقاضا ہے لیکن محبوبوں کی حد سے بڑھے ہوئے نخرے جب لوگ اٹھاتے رہیں، برداشت کرتے رہیں، وہ بھی یہ کیوں سوچیں کہ وہ کہاں غلطی کررہے ہیں۔ شاعر نے شکوہ کیا ہے مگر شکایت نہیں کی کہ اس طرح کا تصور اس زمانے کے محبوبوں سے وابستہ ہوگیا تھا اور آج بھی دفتر میں کام کرنیوالے بھی سب یہ انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ طوائف کے ادارے کا اثر بھی ہے کہ کوٹھے پر بیٹھنے والیوں ہی کو اس طرح کے ناز دکھانے آتے تھے اور لوگ ان کے ناز برداشت بھی کرتے تھے، یہ ایک معاشرتی رویہ ہے اور بالعموم جو باتیں ہم معاشرتی رویّوں کے طور پر اختیار کرلیتے ہیں ان پر غور و فکر کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ انھیں روایت کے طور پر اپنا لیا جاتا ہے۔ ناز، نخرہ معشوقوں کی تو صفت ہے ہر وہ انسان جو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے یہ فن آتا ہے یا دوسرے کو میری ضرورت ہے وہ اس طرح کی روش اختیار کرلیتا ہے۔

جان ٹھہرایا ہے تم کو ہائے کیا کہتے ہیں لوگ
ہم مرے جاتے ہیں، تم کو بے وفا کہتے ہیں لوگ

یہ شعر بھی دہلی کی عام شاعری اور بامحاورہ زبان کے استعمال کی اچھی مثال کہا جاسکتا ہے، 'ہائے' اور 'ہم مرے جاتے ہیں' کی ترکیب یہ شہری بولی ٹھولی کا حصہ تھا اور اسی کا استعمال ان لوگوں کو پسند بہت تھا، وہ دور بھی کچھ اس طرح کا تھا کہ زبان، محاورہ اور روزمرہ پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جاتا تھا مگر عارف کی شاعری ذوق دہلوی یا داغ کی طرح بامحاورہ یا روزمرہ پر زور دینے کی شاعری نہیں ہے ان کے شعری محاسن کو اس سے الگ بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

تا ایک وضع پہ رہوں دائم عذاب میں
ضد سے مری زمانہ نہیں انقلاب میں
غصے میں ان کو کچھ نہ رہا تن بدن کا ہوش
کیا لطف ہم نے شب کو اٹھائے عتاب میں

یہ دونوں شعر اس عہد کی شاعری کے دو رنگوں کو پیش کرتے ہیں، ایک میں وہ استادانہ رنگ ہے جو ناسخ لکھنوی۔ کے یہاں ملتا تھا:

غفلت سے اپنا طالب دید آپ ہوں
میرا ہی چہرہ ہے جو نہاں ہے نقاب میں

جس میں شعر زبان و بیان کے سانچے میں پوری طرح ڈھلا ہوتا تھا۔ اس قطعے کا دوسرا شعر عاشقانہ رنگ کا ہے مگر اس میں جذبات کی شوخی اور احساسات کی رنگینی شامل ہے:

شوخی ہے ان کا شیوہ تو کھلتا نہیں ہے راز
گو وہ کسی کے واسطے ہوں اضطراب میں

یہ شعر بھی اسی مکرِ شاعرانہ کی مثال ہے جو مومن کے یہاں ملتا ہے:

میں ہوں بے تاب وتواں کیوں کر نہ وہ بیباک ہو
صبر اب دل میں کہاں ہے میرے جو اُس پر پڑے

کہیں کہیں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ عارف کے یہاں محاورے کا استعمال عجب انوکھے پن کے ساتھ ہوا ہے، صبر پڑنا محاورہ ہے لیکن اس محاورے کو یہ کہہ کر استعمال کرنا کہ صبر مجھے ہے کہاں جو اس پر پڑے گا کہ وہ تو پہلے ہی ختم ہوگیا یہ بات میں سے بات اور نکتے میں سے نکتہ

پیدا کرتا ہے، یہ ایک طرح سے زبان کی شاعری ہے کہ مضمون آفرینی ہے اور معنی بندی کی جائے مگر زبان کے سہارے پر۔ مرزا قادر بخش صابر 'تذکرۂ گلستانِ سخن' کے مصنف ہیں، اس تصنیف کے کام میں ان کی مولانا امام بخش صہبائی نے بھی مدد کی تھی جس کا اثر اس کی عبارت آرائی پر بھی مرتب ہوا۔ عارفؔ کے ترجمے میں دو تین ضروری باتوں کے علاوہ بیشتر اندازِ گل افشانیِ گفتار ہی ملتا ہے جس کا کچھ اندازہ اس عبارت سے ہوسکتا ہے:

"رنگینیِ سخن سے کاغذ ہم رنگِ گل اور دل پذیریِ کلام سے قلم منقار، بلبل اصناف سخن پر قدرت اور انواعِ کلام پر اقتدار، غزل صحرائے شوخی کا غزال، قصیدۂ گلشن، متانت کا نہال مخمس جس میں کلام کے واسطے حواس، رباعی مانند عناصر اربعہ پیکر سخن کی اساس"[1]

مرزا قادر بخش صابر کا 'تذکرۂ گلستانِ سخن' اسی زمانے میں مرتب ہوا جب زین العابدین خاں عارفؔ نے وفات پائی تھی ان کے احوال میں مرحوم کا لفظ عارفؔ کے ساتھ آیا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ ترجمہ ان کی وفات کے بعد تذکرہ کے صفحات میں شامل کیا گیا، صابر نے ان کا سالِ وفات ۱۲۶۸ھ درج کیا ہے اور انھیں غالبؔ کا شاگرد لکھا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے زمانۂ حیات میں غالبؔ کے شاگرد کی حیثیت سے مشہور تھے، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے غالبؔ کے ادبی شعور اور اردو یا فارسی سے کیا اثرات قبول کیے، اور قبول بھی کیے یا نہیں؟

مرزا قادر بخش صابر نے ان کے ضخیم کلیات کا ان لفظوں میں ذکر کیا ہے: "دیوانِ ضخیم اس کی یادگار ہے" (ص ۱۶۸)۔ اس ضخیم کلیات کے مشمولات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی اور اس میں جو اصنافِ شعر ہیں ان کا بطورِ خاص کوئی ذکر نہیں کیا اس رجحان کی طرف بھی صابر کے یہاں کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ انھیں اہلِ بیت سے عقیدت تھی اور اس گہری عقیدت کا اظہار ان کے قصائد اور مرثیوں سے ہوتا ہے۔

بہ ایں ہمہ صابر نے ان کا ایک اچھا مگر مختصر انتخاب دیا ہے جس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کرسکتے ہیں کہ انھوں نے عارفؔ کے کلام کا کم سے کم غزلوں کی حد تک دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا، یہ انتخاب پندرہ شعروں پر مشتمل ہے اور یہ تین شعر اس میں خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں:

---

[1] تذکرۂ گلستانِ سخن، ۱۲۷۱ھ، مرزا قادر بخش صابر، ص ۱۹۸۔

جگر و دل کوئی پتھر کا کہاں سے لائے
اب تو بیٹھا نہیں جاتا ترے بیمار کے پاس

سخت شرمائے میں اتنا نہ سمجھتا تھا انھیں
چھیڑنا تھا تو کوئی شکوۂ بے جا کرتا

بے کسی میں مجھے ہوتی ہے غنیمت وہ بھی
کوئی جس وقت مرے سر پہ بلا آتی ہے

مرزا قادر بخش صابر عارفؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

''عارف تخلص، نواب زین العابدین خاں مرحوم خلف رشید نواب غلام حسین خاں ... مسرور تخلص، شاگرد مرزا اسداللہ خاں غالبؔ سلمہ اللہ تعالیٰ زبان اردو کو ہم پلۂ فارسی اور مضامین شعریہ کو ہم پایۂ حکمت کر دیا تھا۔ رنگینیِ سخن سے کاغذ ہم رنگِ گل اور دل پذیری کلام سے قلم منقار بلبل اصناف سخن پر قدرت اور انواعِ کلام پر اقتدار غزل صحرائے شوخی کا غزال، قصیدہ گلشن متانت کا نہال، مخمس کلام کے واسطے حواس، رباعی مانند عناصر اربعہ پیکر سخن کی اساس، سن بارہ سو اڑسٹھ ہجری میں رختِ سفر باندھ گلشن جناں کی طرف راہی ہوا۔ کاش عارفؔ کے احوال میں تجاہل عارف کو کام نہ فرمائیں''۔[1]

حمیدہ سلطان صاحبہ نے اپنے دور میں عارفؔ کی ادبی اہمیت اور شاعرانہ حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عارفؔ نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کے نواسے تھے، شعر و ادب کا ذوق ان کو نانا سے ورثے میں ملا تھا ایسے ذی علم نانا کی گود میں آنکھ کھولی پھر غالبؔ جیسے شہبازِ سخن سے استفادہ کیا اس لیے اپنے ہم عصر شعرا میں عارفؔ کو ممتاز درجہ ملا''۔[2]

حمیدہ سلطان صاحبہ کا یہ بیان دراصل 'طبقات شعرائے ہند' میں مولوی کریم الدین کے ترجمۂ

---

[1] تذکرہ گلستانِ سخن، مرزا قادر بخش صابر، ۱۲۷۱ھ، ص ۱۹۸۔
[2] خاندانِ لوہارو کے شعرا، حمیدہ سلطان صاحبہ، ۱۹۸۱ء، ص ۶۷۔

عارف سے ماخوذ ہے۔ کریم الدین نے عارف کا تذکرہ اچھی خاصی تفصیل سے کیا ہے اور ان کی شاعری پر اپنی رائے سپردِ قلم کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عارف تخلص، نام نواب زین العابدین خاں، خواہر زادہ نواب اسد اللہ خاں مرزا نوشہ غالب کے۔ ابتدا میں میاں نصیر سے شعر کہنا سیکھا اور اس کے ہی طور پر ایک دیوان بھی لکھا مگر بعد آنے نواب اسد اللہ خاں مذکور کے اکبر آباد سے، نصیر سے اصلاح لینا چھوڑ کر ان کی خدمت میں رہنا شروع کیا''۔[1]

اس بیان کا یہ حصہ خاص طور پر محلِ نظر ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے آگرے سے آنے پر ان کی شاگردی اختیار کی، دوسرے غالب اپنی شادی کے بعد ایک زمانے تک آگرے میں رہے ہوں اس کا امکان کم ہے عارف کی پیدائش، غالب کے قیامِ دہلی کے زمانے میں ہی ہونی چاہیے اس لیے کہ آگرے سے آنے کے بعد کا جملہ اپنی طرف بے اختیار متوجہ کرتا ہے ان کی خدمت میں عارف رہنے لگے آخر یہ کس سنہ کی بات ہے جب تک اس کا یقین نہ ہو۔

کریم الدین کا یہ بیان اپنی جگہ تحقیق طلب ہے کہ غالب کی شادی ۱۸۱۰ء میں ہوئی۔ اگر کریم الدین کے اس بیان پر اعتبار کریں تو غالب کی دہلی میں آمد اور مستقل قیام کا زمانہ ۱۸۲۵ء کے بعد کسی وقت قرار دیا جاسکتا ہے، مگر غالب اپنی شادی کے بعد اتنی لمبی مدت تک آگرے میں قیام پذیر رہے ہوں اس کا امکان کم ہے کیوں کہ یہ وقت پندرہ برس سے بھی زیادہ مدت کو محیط نظر آتا ہے۔

کریم الدین نے مذکورہ ترجمہ میں مزید یہ لکھا ہے:

''انھوں نے اپنے ڈھنگ پر ان کو کتب فارسی کی تعلیم اور اصلاح شعر کی دی، چنانچہ بہت دنوں بعد ایک دیوان مسمّٰی بہ 'مطلع مہر سعادت' انھوں نے فراہم کیا۔ اس میں قصائد اور قطعات، غزلیں اور مدحتیں، ترجیع بند اور مخمس و مسدس، معشر وغیرہ بہت موجود ہیں، میں نے وہ دیوان دیکھا ہے اس کو کلیات کہنا چاہیے''۔

ظاہر ہے کہ یہ کلیات بہت تھوڑی عمر میں تو تیار نہیں ہوسکتا اس میں جس طرح کے قصائد ملتے

---

[1] عارف، غالب کے نہیں، ان کی بیگم کے بھانجے تھے۔

ہیں وہ نوعمری میں کہے گئے قصائد نہیں لگتے کم از کم اس وقت عارفؔ کی عمر پچیس اور تیس برس کے درمیان ہونی چاہیے تبھی مختلف اصنافِ شعر پر مشتمل اس دیوان کی ترتیب کے مسائل کو کچھ زیادہ بہتر صورت میں سمجھا جاسکتا ہے۔ پینتیس سال کی عمر میں عارفؔ کا (۱۸۵۲ء میں) انتقال ہوگیا۔ عارفؔ کا سالِ وفات ان حقائق کی روشنی میں ۱۸۵۲ء ہونا چاہیے۔ کریم الدین کی اس ادبی تاریخ یا 'طبقاتِ شعرائے ہند' کا زمانہ تالیف ۱۸۴۷ء ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۴۷ء تک جب ان کی عمر صرف تیس برس تھی یہ سب کچھ لکھا جاچکا تھا، اب یہ بھی ممکن ہے کہ کریم الدین کے یہاں اس بات کا اضافہ ہو، اگر تذکرہ کی ترجمہ نگاری اور اس کی ابتدائی روایت کی تکمیل کے وقت تک یہ سب کچھ ہوگیا تو پھر عارفؔ کے کمالِ سخن کا جہاں اعتراف ضروری ہے وہاں اس ضمن میں جو سوالیہ نشان ذہن کی سطح پر ابھرتے ہیں ان پر بھی غور کرنا چاہیے۔ بہرحال عارفؔ کے شاعرانہ رُتبے کا یقین کرتے وقت مولوی کریم الدین کی زبانِ قلم پر جو کلمات آئے ہیں وہ درجِ ذیل ہیں:

> ''حقیقت میں یہ شاعر بڑے رُتبے کا ذی قدر، قابل و لائق، تحسین و آفرین ہے، فارسی میں بڑی دستِ قدرت ہے، جن ایام میں میرے چھاپہ خانہ میں مشاعرہ ہو: کرتا تھا یہی شاعر میرِ مجلس اور میرِ مشاعرہ مقرر تھا اور اس کے اشعار گلدستۂ نازنیناں نے بھی مندرج کیے ہیں''۔

جس کے معنی ہیں کہ اُس وقت تک عارفؔ کا کلام سامنے آچکا تھا اور اصنافِ سخن کے اعتبار سے اُس کلام کی رنگارنگی بھی ایک واضح صورت اختیار کر چکی تھی جب کہ عارفؔ کی عمر صرف تیس برس تھی اور وہ بیماری میں بھی مبتلا تھے جس کا کچھ اندازہ مولوی کریم الدین کے بیان کے اس حصے سے بھی ہوتا ہے: ''اب ان ایام میں بہ سبب جدتِ ذہن اور تیزیِ سخن سوکھ کر مثل کانٹا ہوگیا ہے''۔

اتنی کم عمر میں اتنا بہت سا کلام جمع کر لینا غیر معمولی کمالات کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر حالات کے بعض نازک پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے اسی سے کچھ سوالات بھی پیدا ہوئے ہیں جس کے بعد یہ مسئلہ مزید تحقیق طلب ہوجاتا ہے، اس میں دوسرا دیوان 'مطلعِ مہرِ سعادت' بھی آجاتا ہے، اگر مزید یہ فقرے بھی شامل کیے جائیں تو پیشِ نظر حقائق کے بعض دوسرے پہلو بھی جو ان کے کلام و کمال سے متعلق ہیں، سامنے آجاتے ہیں ''فی البدیہ کہنے کا بھی

درک ہے تاریخ کہنے میں بھی بہت اچھی قدرت رکھتا ہے، مادہ بھی اچھا نکالتا ہے۔ چناں چہ میری کتاب 'گلدستۂ نازنیناں' کے اختتام پر دو تاریخیں اس نے لکھی ہیں، ایک اردو، دوسری فارسی ہے۔ ایک مصرع اردو سے کیا اچھی تاریخ نکالی ہے وہ یہ ہے:

کہو گلدستۂ گلزارِ جنت"۔

عارف کے کمالات سے مولوی کریم الدین کافی متاثر نظر آتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے:

> ''غرض یہ کہ شعر کہنے میں اس نے قدرت پائی ہے کوئی غزل بجز ساٹھ اور استی شعر کے کل مضامین رنگا رنگ میں نہیں کہتا اور سب اچھی اور مضمون نئے انداز پر ہوتے ہیں"۔

اس میں شاہ نصیر کے طرزِ سخن اور اسلوبِ ادا کی جو جھلکیاں ملتی ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھیں کی طرف اشارہ ہے۔

جیسا کہ عارف کی شاعری کے سلسلے میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس زمانے میں طویل غزلیں کہنے کا رواج تھا اور اسے استادانہ کمالات میں شامل کیا جاتا تھا کہ ایک غزل میں جتنے قافیے آسکے ان کو ضرور کام میں لایا جائے، ان کی بندش پر اہلِ سخن ناز کرتے تھے لیکن اس طرح کے طرزِ کلام اور نمونۂ کلام میں ندرتِ فکر اور جدتِ مضامین سے زیادہ مشقِ سخن کام آتی تھی، وہی صورت شروع سے آخر تک عارف کے یہاں بھی ہے۔ بہر حال مولوی کریم الدین نے جو کچھ لکھا ہے اور جس انداز کے ساتھ لکھا ہے وہ ایک معاصرانہ حوالہ ہے جس کی روشنی میں ہم عارف کی شاعری اور ادبی شعور سے متعلق ان کے معاصرین کی رائے کو سمجھ سکتے ہیں۔

قصائد و قطعات اور دوسرے اصنافِ شعر

نواب زین العابدین خاں عارف اپنے زمانے میں شعر اور فنونِ شعر سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے، اس کا ایک بہت نمایاں ثبوت تو ان کا دیوانِ غزلیات ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور پہلی نیز دوسری جلد میں ان کے قصائد، قطعات اور دوسرے شعری اصناف کے نمونے موجود ہیں جو اچھی خاصی تعداد میں ہیں اور جنھیں اگر یکجا کر کے شائع کیا جائے تو

وہ قابلِ قدر اور لائقِ ذکر اشعار پر مشتمل ایک اچھا خاصا ضخیم شعری مجموعہ ہوگا۔

عارفؔ کے شعری رجحانات پر بہت کم لکھا گیا اور خاندانِ لوہارو کے دوسرے شعرا کے ساتھ وہ بھی ہمارے تذکروں اور شعری مطالعات کی زینت نہیں بنے، اس کی وجہ غالباً ان کی خاندانی وجاہت اور وراثت بھی تھی۔ ہم نے ادب وشعر کے سلسلے میں روٗسا اور اُمرا کی سرپرستیوں کا تو ذکر کیا لیکن ان کی شاعری کو زیادہ قابلِ توجہ اور لائقِ اعتنا تسلیم نہیں کی، اس میں اس خیال کو بھی دخل رہا کہ ان روٗسا کا کلام زیادہ تر ان شعری تخلیقات پر مبنی یا مشتمل ہے جو ان کے اہلِ دربار نے بطور نذرانہ کلام ان کو پیش کیا۔ نواب کلب علی خاں بھی شاعر تھے، ان کے والد یوسف علی خاں بھی، نواب آصف الدولہ بھی اور واجد علی شاہ بھی، لیکن ان کا ذکر بحیثیت شاعر نسبتاً کم ہی آیا باوجود اس کے کہ غالبؔ کے شاگرد تھے۔ خاندانِ لوہارو میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کے علاوہ کم ہی افراد توجہ کے مستحق قرار پائے۔ عارفؔ فراموش نہیں کیے گئے کہ غالبؔ کی حیات اور ان کے خاندانی حالات کے ضمن میں عارفؔ کا ذکر آتا رہا لیکن دو جلدوں پر مشتمل اتنے بڑے دیوانِ غزلیات کے مصنف اور شاعر ہیں اور غزلیات کے ساتھ دوسرے اصنافِ شعر کے نمونے بھی بڑی تعداد میں ان کے ہاں ہیں۔ اس کا ذکر مشکل ہی سے کہیں آتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کا رنگِ سخن تقلیدی ہے اور ایسے طبع زاد مضامین ان کے یہاں نہیں ہیں کہ شعر اپنی ندرت کی وجہ سے زبانوں پر چڑھ جائے یا ذہنوں میں گونجے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ حمیدہ سلطان مرحومہ نے 'خاندانِ لوہارو کے شعرا' اور ادبی خدمات کے سلسلے میں کتاب لکھی لیکن وہ بھی حقائق کو پوری طرح جمع نہیں کر سکیں یہاں تک کہ عارفؔ کا دیوان بھی ان کی نظر سے نہیں گزرا، اگر گزر جاتا تو ان کی نوکِ قلم سے تنقیدِ عارفؔ کے سلسلے میں وہ فقرے نہیں نکلتے جو ہم ان کی تصنیف میں دیکھتے ہیں مثلاً یہ کہ وہ غالبؔ کے رنگ میں لکھتے تھے جب کہ ان کی پوری کلیات غالبؔ کی شاعری کا سایہ معدودے چند اشعار میں ان کے یہاں ہے۔ غالب نے اردو میں چار قصیدے ضرور لکھے لیکن کوئی مخمس، مسدس، ترکیب بند یا ترجیع بند نہیں لکھا۔ عارفؔ کے یہاں اس کی ایک اچھی اور قابلِ لحاظ تعداد موجود ہے۔ انھوں نے ان شعری اصناف پر کوئی رائے نہیں دی، دیتیں بھی کیسے کہ یہ کلیات ان کی نظر سے ہی نہیں گزری اور شاید کسی اور نے بھی اس کا مطالعہ کر کے اس کے مشمولات پر کوئی تنقیدی گفتگو نہیں کی یہاں تک کہ اس کا تعارف نامہ بھی کہیں

دیکھنے کو نہیں ملتا۔ یہاں ان اصنافِ شعر کا اس حد تک حوالہ پیش کیا جا رہا ہے کہ ان کے مطلعے بھی لکھ دیے گئے ہیں، تعدادِ اشعار بھی، اور اگر مخمس اور مسدس کی صورت میں ہے تو کتنے بند اس کے مشمولات میں ہیں، ان کی اور اشعار کی تعداد بھی دے دی گئی ہے۔

قصیدہ (۱)

اس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر جدول بنایا گیا ہے لیکن نگارش سے محروم ہے، مطلع یہ ہے:

بزم سے اپنی اٹھا کر ہم کو پنہاں کردیا
دستِ حسرت جو ہمارا وقفِ دنداں کردیا

یہ غزل نما قصیدہ ہے اور ایک گونہ مدح وثنا کے مضامین سے متعلق ہے، اس قصیدے کی تعدادِ اشعار چالیس ہے۔

قصیدہ (۲)

یہ قصیدہ عارفؔ نے خود اپنے تعارف نامے کے طور پر لکھا ہے لیکن مطلعِ ثانی حضرت علی کی منقبت سے شروع ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ابتدائی حصہ جو تمہید یا تشبیب ہے اس میں شاعر نے اپنی تعریف لکھی ہے ایسا تشبیب کے اشعار میں روایت شعر گوئی وقصیدہ نگاری کے مطابق ہو جاتا ہے، مطلعِ ثانی میں شاعر اصل قصیدہ کے موضوع کی طرف آیا ہے اور گریز کے شعر کے طور پر لکھا ہے:

خجل ہمیشہ رہے اس سے مطلعِ خورشید
لکھوں وہ مدحتِ حیدر میں مطلعِ ثانی

مطلعے سے پہلے جدول موجود ہے مگر کسی تحریری اندراج سے خالی یہ قصیدہ چوراسی شعروں پر مشتمل ہے۔

قصیدہ (۳)

اس قصیدے کے جدول میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: ’’قصیدہ در نعتِ جنابِ رسالت مآب سیّد المرسلین خاتم النبیین حبیبِ خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم‘‘:

رکھے وہ خاتمے کو گر سرِ مزار انگشت
جلے ہمارے تفِ دل سے شمع وار انگشت

مشکل زمین میں لکھا گیا قصیدہ ہے اور مطلع میں فاتحہ پڑھنے کا ایک رویہ بھی سامنے آیا ہے،
وہ یہ کہ مزار پر انگلی رکھ کر فاتحہ پڑھی جاتی ہے، یہ ایک خاص طریقہ رہا ہے اور بعض لوگ اس
طرح فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ اس قصیدے میں کل چالیس شعر ہیں۔

قصیدہ (۴)

یہ قصیدہ بھی حضور اکرم حضرت محمد صلعم کی شان میں ہے لیکن جدول میں جو عبارت نقل
کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی کے لیے لکھا گیا ہے۔

''قصیدہ در منقبت جناب و مستطاب امیر المومنین، امام المتقین شیرِ خدا
علی مرتضیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام''۔

جس کے معنی ہیں کہ نقلِ تحریر کے وقت کاتب نے اندراج میں ضروری احتیاط بھی نہیں برتی،
یہ قصیدہ اس مطلعے سے شروع ہوتا ہے:

بیاں میں کیا کروں شانِ محمدؐ
خدا جب ہو ثنا خوانِ محمدؐ

یہ قصیدہ اُنتیس شعروں پر مشتمل ہے، ہم ان اشعار کو صرف تمہیدی اشعار نہیں کہہ سکتے کہ اس
طرح یہ حضور رسالت مآب کی شان میں ایک گونہ گستاخی ہو جاتی ہے۔

قصیدہ (۵)

اس کے جدول میں کوئی عبارت رقم نہیں کی گئی لیکن مطلعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ
بھی نعتیہ ہے، وہ مطلع یہ ہے:

رُتبہ میں خطۂ دہلی نہیں کچھ عرش سے کم
یعنی موجود ہے اس جا بھی تیرا نقشِ قدم

قدمِ رسول کا نشان دہلی میں ایک قبرستان میں موجود ہے، یہ قبرستان قدمِ رسول یا قدم
شریف ہی کہلاتا ہے اور اس اعتبار سے یہ مطلع غیر معمولی ہے، اس میں مطلعِ ثانی بھی آیا ہے اور
اس کے لیے جدول بھی تیار کیا گیا ہے لیکن یہ جدول سادہ ہے۔ مطلعِ ثانی کا پہلا شعر یہ ہے:

اس کا عالم نہیں جز خالقِ ہر دو عالم
جو تری صورت و سیرت میں ہیں معنی مدغم

تیسرے مطلعے کے لیے بھی جدول ہے مگر اندراج سے محروم ہے، اس میں مطلع نہیں ہے،

تیسرے اور چوتھے حصے کے قصیدے کے قطعے میں تیسرا حصہ یوں شروع ہوتا ہے:

حق تعالیٰ سے کیا منشیِ تقدیر نے عرض
بھر کے ٹھنڈا سا بڑی حسرت و افسوس سے دم

قصیدے کا چوتھا اور آخری حصہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

نہ تو مفلس ہے کوئی اور نہ کوئی ہے مغلوب
عام ہے بسکہ زمانے میں تیرا عدل و کرم

قصیدہ (٦)

ے کشو مژدہ کہ وہ دن گئے سختی کے نکل
سبز و شاداب ہوا پھر چمنستانِ آمَل

اس مطلع کے ساتھ شروع ہونے والا قصیدہ ایک طویل قصیدہ ہے لیکن اس کے تعارف نامے کے طور پر کسی بات کی نشاندہی نہیں کی گئی، یہ قصیدے کی معروف زمین ہے۔ فارسی میں عرفیؔ اور اردو میں سوداؔ جیسے قصیدہ نگار اس پر طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ تمہیدی اشعار کے بعد پھر مطلع آیا ہے اور اس کے شروع میں جدول بھی موجود ہے لیکن تحریر و نگارش سے محروم۔ ان کے اشعار سے ایک داخلی شہادت کے طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت علی کی منقبت میں ہے، وہ شعر یہ ہے:

یا علی کہہ کے میں ہر کام کیا کرتا ہوں
کیوں نہ حل ہوویں میرے عُقدۂ مالاینحل

اسی سلسلۂ اشعار میں یہ شعر بھی آئے ہیں جو اشعارِ منقبت کے اعتبار سے بہترین ابیات میں شامل ہو سکتے ہیں:

اُس کے دشمن کے سوا ہے کسے قسمت سے گِلہ
جب کہ وہ کاتبِ تقدیر پہ ہوا روزِ ازل

رکھ دیے لوح و قلم سامنے اس کے لاکر
روزِ میثاق میں خلاقِ جہاں نے اوّل

بے طلب اس کی عطا وہ ہے کہ جس کو سائل
نہ سکے سلطنتِ عالمِ امکاں سے بدل

اس کے معنی ہیں کہ شاعر نے مطلعِ ثانی مدح میں کہا تھا۔ اس موقع پر یہ بھی کہہ دیا جائے کہ اپنے قصیدوں کے مضمون اور طریقۂ رسائی کے اعتبار سے عارف کے قصیدے غزلوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر اور غیر معمولی نظر آتے ہیں۔

چوتھا مطلع:

بے ادب ہوں جو کہوں فرش زمیں ہے یہ جبل
کچھ میری چشم نہیں عرشِ معلّیٰ، بہ مثل

مطلعِ خمس:

پانچواں مطلع بھی جدول سے ضرور آراستہ ہے مگر تحریرِ نگارش سے وہ بھی محروم ہے، یہ مطلع اس شعر سے عبارت ہے:

تیرے اعمال پہ عاشق ہے خداوندِ ازل
حسنِ یوسف سے بھی بہتر ہے تیرا حسنِ عمل

اس کے بعد جو جدول دی گئی ہے اس میں عارف کا تخلص آنا چاہیے، یہ شعر اس طرح ہونا چاہیے:

عارف اتنا بھی مناسب نہیں یہ طولِ کلام
ہاتھ اٹھا پیشِ خدا بہر خداوندِ اجل

نگارش سے 'عارف' کا نقطہ غائب ہے۔ اس کے بعد تین شعر آئے ہیں جن میں دعائیہ مضمون کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اس قصیدے میں کل ایک سو بیس اشعار ہیں۔

قصیدہ (۷)

چمن میں دیکھ لیا کس کو ناگہاں نرگس
کہ تو ہے عالمِ حیرت میں ہر زماں نرگس

اس مطلع کے ساتھ بھی جدولی تحریر کی وہی صورت ہے کہ جدول تو ہے مگر تحریر و نگارش نہیں، اس کی ردیف خوب صورت ہے اور نرگس ردیف کے ساتھ مشکل ہی سے کوئی قصیدہ لکھا گیا ہوگا مگر اس کے حسین اور پُر کشش ہونے میں کوئی شک نہیں، یہ قصیدہ اکیاسی شعروں پر مشتمل ہے۔ اس کی روش و کشش کا کچھ اندازہ ان شعروں سے ہو سکتا ہے:

یہ شغلِ دید میں رہتی ہے رات دن مشغول
کہاں سے ہوگئی، حیرت ہے، رازداں نرگس
سوائے اس کے نہیں کوئی مالکِ زر و سیم
دیارِ باغ میں بے شک ہے مُرزباں نرگس
مجال ہے کہ تجھے رہ وے تاب نظارہ
جو جلوہ گر ہو سرِ اشکِ گلستاں نرگس

اس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کرسکتے ہیں کہ عارفؔ نے نئی زمینیں بھی نکالیں۔

قصیدہ (۸)

اک داغِ غم سے کم نہیں کنعاں میں آفتاب
یعقوب کا جو قید ہے زنداں میں آفتاب

اس قصیدے کی ردیف آفتاب ہے، یہ چوّن شعروں پر مشتمل ہے۔ خاتمے کے اشعار سے پہلے جدول میں یہ شعر لکھا گیا ہے اور یہاں بھی عارفؔ کا لفظ پہلے مصرعے سے غائب ہے۔ اس کے اضافے کے ساتھ ہی پہلے مصرعے کا وزن پورا ہوتا ہے۔ مخطوطہ نہیں، زیروکس کاپی میرے پیش نظر ہے، مقطع میں تخلص عارفؔ شنگرفی لکھنے کے لیے چھوڑا گیا لیکن لکھا نہیں گیا۔ شعر یہ ہے:

عارف چنا ہے ہم نے بھی اُس کے نثار کو
ہیں گل کی، جائے جیب و گریباں میں، آفتاب

قصیدہ (۹)

قصیدہ درمنقبت (حضرت امام حسن و[1]) حضرتِ امام حسین:

ایک مختصر سے سنیے، یہ میرے کلام دو
جو کچھ کہ ہیں جہان میں ہیں، یہ امام دو

اس زمین میں سوداؔ کا بھی قصیدہ ہے۔ یہ چالیس شعروں پر مشتمل ہے جو حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین کی منقبت کے متعلق اشعار ہیں اور دونوں کے اسمائے مقدسہ اس طور پر لکھے گئے ہیں:

"قصیدہ درمنقبتِ امامینِ معصومین وجگر گوشۂ رسول الثقلین امام حسن و حسین علیہم اُلتہیت و التسلیم"۔

---

[1] قوسین کی عبارت کرم خوردہ عبارت کی قیاسی تصحیح ہے۔

(۱) وہ کون ہیں حسین و حسن ہادیِ انام
منقوش لوحِ دل پہ میرے ہیں یہ نام دو

(۲) رہتے ہیں یا تو عرش پہ (یا) لامکاں پہ وہ
زیبا ہیں ان کے واسطے یہ ہی مقام دو

(۳) بے شبہ حکم دیتے ہیں وہ ہو کے یک زباں
عالم میں گو کہ کرتے ہیں اب انتظام دو

(۴) یہاں گر جدا جدا وہ سپید و سیہ کریں
دو صبح ہوں جہاں میں پھر اور شام دو

یہ ایک مشکل امر ہے کہ دو آدمیوں کی مدح ایک ساتھ کی جائے لیکن شاعر کی فنکارانہ حیثیت نے اس مسئلے کو اپنے لیے آسان کرلیا۔ اوپر کے شعروں میں دو کے ساتھ دونوں اماموں کا ذکر بہت مقامات پر ایک ہی حیثیت سے آیا ہے۔

قصیدہ (۱۰)

''قصیدہ در منقبتِ قرۃ العینین علیؑ مرتضیٰ حضرت امام حسین مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام''۔

گزرا شب (دو) شنبہ عجب ایک ماجرا
پنہاں کروں میں کس لیے کہتا ہوں برملا

یہ قصیدہ ایک سو سینتالیس شعروں پر مبنی ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ حضرتِ امام حسین کے لیے ہے۔ چھبیس شعروں کے بعد پھر مطلعِ ثانی آیا ہے جو جدول میں لکھا گیا ہے اور اس سے پیشتر یہ شعر ہے:

مطلع یہ یاد کر لے پڑھا کر اُسے مُدام
باصد حضورِ قلب و بصد گریہ و بُکا

جس مطلعے کے لیے کہا گیا ہے وہ یہ ہے:

روحی فِداکا اے گلِ گلزارِ مصطفیٰ
قلبی 'لذیکَ' اے دُرِ دریائے مُرتضیٰ

اس کے بعد پھر حضرت امام حسین ہی کے لیے قصیدہ موجود ہے جس کے ساتھ جدول میں عبارت ملتی ہے۔

قصیدہ (۱۱)

''قصیدہ در منقبت فرزندِ شیرِ خدا حضرت امام حسین سیّد الشہدا علیہ الصلوٰۃ والسلام''
اس کا مطلع یہ ہے:

ہے اپنی نظر جو تیرے رخ پہ تہہ خنجر
کی، سیرِ چمن ہم نے، ستم گر تہہ خنجر

اس میں کوئی مطلعِ ثانی نہیں ہے، یہ صرف چالیس شعروں پر مشتمل ہے اور خنجر ردیف کے ساتھ یہ بھی ایک مشکل زمین میں کہا ہوا قصیدہ ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ زبان کی وہ استادانہ گرفت جو قصیدوں میں ملتی ہے وہ عارف کی غزلیہ شاعری میں نہیں ملتی۔ ممکن ہے انھوں نے اردو قصیدہ گوئی میں غالبؔ سے کوئی فائدہ اٹھایا ہو مگر غالبؔ کو اردو زبان میں قصیدہ گوئی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسی لیے ان کے اردو میں صرف چار قصیدے ملتے ہیں۔ دو منقبت ہیں شاہِ وقت کی مدح میں، ایسی صورت میں یہ سوچنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اردو قصیدوں میں عارفؔ کی کوئی مدد کی ہوگی۔ وہ غلط طور پر ہی صحیح یہ تصور کرتے تھے کہ اردو قصیدہ گوئی کے لائق زبان نہیں ہے اسی لیے ان کے تمام تر قصیدے یا قصیدہ نما قطعات فارسی میں ملتے ہیں۔

قصیدہ (۱۲)

اس کے بعد کے جدول میں صرف ایضاً لکھا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ قصیدہ بھی حضرت امام حسین کی منقبت میں ہے، اس کا مطلعِ اوّل یہ ہے:

کہا یہ جوہرِ اوّل سے چرخ نے اک بار
کہ اے مقرّبِ درگاہِ داورِ دادار

اس مطلعے میں جوہرِ اوّل کا لفظ آیا ہے، یہ یونانی فلسفے سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد اختراعی مادہ ہے جو تخلیقِ کائنات میں جوہرِ اوّل کے طور پر کام آیا۔ اسے عقلِ اوّل بھی کہتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عارفؔ کو فلسفیانہ خیالات سے استفادہ کا موقع بھی ملا تھا۔

اس کے مطلعِ ثانی کو جدول میں دیا گیا ہے اور اس کو مطلعِ ثانیہ لکھا گیا ہے۔ اشعار کی کل تعداد ایک سو اکیاون ہے۔ مطلعِ ثانی کا پہلا شعر یہ ہے:

نہیں ہوں غم میں، ترے اپنی جان سے بیزار
کہ ایک دن مجھے کرنی ہے تیری رہ پہ نثار

قصیدہ (۱۳)

اس کے جدول میں بھی ایضاً لکھا ہے، جس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ بھی نعت و منقبت میں ہے۔ اس زمین میں ذوقؔ کا قصیدہ بھی ہے اوران کے اہم قصائد میں ہے۔ اس اعتبار سے عارفؔ کی اہمیت بہ حیثیت قصیدہ گو بڑھ جاتی ہے۔ خاص طور پر ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے کہ وہ بہت تھوڑی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے اور ان کا آخری وقت بیماریوں میں گزرا۔ یہ قصیدہ ستّر شعروں کو محیط ہے، اس کا مطلع یہ ہے:

صدفِ چشم میں ہیں میرے بھی کیا کیا گوہر
ایک سے ایک سرشکوں میں ہیں اعلیٰ گوہر

قصیدہ (۱۴)

اس قصیدے کے جدول میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: ''قصیدہ در نعت'' یہ قصیدہ بھی اسی زمین میں ہے۔ مطلع کا شعر یہ ہے:

بن رگِ ابرِ قلم، خوب سے برسا گوہر
آج مطلوب ہیں مجھ کو دمِ انشا، گوہر

یہ قصیدہ اٹھہتّر شعروں پر مشتمل ہے، اس میں بھی مطلعِ ثانی موجود نہیں ہے۔

قصیدہ (۱۵)

اس قصیدے میں جدول تو آیا ہے لیکن کوئی عبارت موجود نہیں ہے۔ یوں بھی اس نسخے کا کاتب پوری طرح اس معاملے میں احتیاط نہیں برتتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس قصیدے کو شروع کرتے وقت بھی اس نے کسی طریقے کی نشان دہی نہیں کی۔ مطلع یہ ہے:

کس لیے جاتی ہے تو سوئے گلستاں اے صبا
جا تجھے بھیجوں جہاں، میں تیرے قرباں اے صبا

یہ بھی اچھا خاصا طویل قصیدہ ہے اور بہتّر شعروں پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ حضرت شہید کربلا کے متعلق ہے۔

قصیدہ (۱۶)

اس کے جدول میں یہ عبارت آئی ہے:

''قصیدہ درمنقبت امام معصوم حضرت امام زین العابدین علیہ السلام''

اس سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ درمیانی قصیدے بھی قصائد نعت ومنقبت میں ہیں۔
اس قصیدے کا مطلع عارف کے نام کے ساتھ آیا ہے اور یہ ایک نئی بات ہے:

کس لیے خاموش ہے اے عارفِ شیریں سخن
ناگوارِ طبع ہے گر چُپ رہے مرغِ چمن

اس قصیدے میں اشعار کی کل تعداد باسٹھ ہے۔

قصیدہ (۱۷)

اس قصیدے کا جدول بھی خالی ہے اور اس کے ذیل میں جس زمینِ سخن میں قصیدہ انشا کیا گیا ہے اس کو اس مطلعے سے سمجھا جا سکتا ہے:

وہ میرے حالِ زبوں کی کبھو جو دیکھے فال
تو خون رووے، بصد چشم، قُرعۂ رمّال

اس قصیدے میں اشعار کی کل تعداد ایک سو چھے ہے لیکن مطلع ایک ہی ہے۔

قصیدہ (۱۸)

اس کے جدول میں یہ عبارت دی گئی ہے: ''قصیدہ درمنقبت گوہر سیادت، مظہرِ خالق حضرت امامِ جعفر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام''۔ اس کا مطلع یہ ہے:

کیا رویے سپہرِ ستم گر کے سامنے
پڑ رہیے کیوں نہ میکدہ کے در کے سامنے

یہ قصیدہ تریسٹھ شعروں پر مشتمل ہے۔ یہ بھی ایک مطلعے کا قصیدہ ہے۔

قصیدہ (۱۹)

اس کے جدول میں یہ عبارت درج ہے: ''قصیدہ درمنقبت بروجِ مبین امام محترم حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام''۔ مطلع یہ ہے:

جہاں میں تجھ کو سخن سنج کہتے ہیں عارف
ترے لیے ہیں شایاں یہ ہرزہ گفتاری

اس کے بعد کا جو جدول ہے وہ بالکل خالی ہے اور اس کے ذیل میں آنے والا مطلع یہ ہے:

وہ قتل کرکے، مری کرتے ہیں عزا داری
فَقَط دِیَت کے بچانے کو ہے یہ عیاری

اس کے آخر میں مقطع آیا ہے:

عجب نہیں ہے جو ہو اُس کو مجھ سے بے زاری
سزا ہے اس کی یہی جو کرے وفاداری

جس کا مطلب ہے کہ یہ درمیانِ قصیدہ میں آنے والی غزل ہے، اس کے اشعار کی تعداد بارہ ہے۔ تیسرا حصہ قطعہ ہے جو یوں شروع ہوتا ہے:

ثنا نگارِ ائمہ ہوا ہے تو مشہور
سمجھ یہ اپنے لیے خاص لطفِ غفاری؟

قصیدہ (۲۰)

اس کے جدول میں یہ عبارت درج ہے: ''قصیدہ درمنقبت جناب امام الاتقیا حضرت امام علی موسیٰ رضا علیہ السلام''۔ اس کا مطلع کا شعر یہ ہے:

میں نے کب دانستہ کھائے ہیں، یہ اے غمخوار، گل
داغِ غم دل پر کھلاتا ہے نیا ہر بار گل

ہمارے یہاں شعرا نے آوازوں کی تکرار پر غور نہیں کیا یا ان کے باہمی ٹکراؤ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ قصیدہ ساٹھ شعروں پر مشتمل ہے۔

قصیدہ (۲۱)

اس کے جدول میں کوئی عبارت نہیں ہے۔ یہ قصیدہ امام حضرت موسیٰ رضا کی شان میں ہے، مطلعے کا شعر یہ ہے:

نام ہے مشہور جس کا حضرت موسیٰ رضا
دیکھتی ہے کیوں با حسرت جن کے درباں کی طرف

اے صبا کہنے سے میرے جا خراساں کی طرف
آج رکھ موقوف چلنا تو گلستاں کی طرف

اس قصیدے میں اشعار کی کل تعداد ترپن ہے۔

قصیدہ (۲۲)

اس کے جدول میں یہ عبارت نقل کی گئی ہے: ''قصیدہ در منقبت سالار دودمانِ مرتضیٰ حضرت امام محمد تقی علیہ الصلوٰۃ والسلام'' اس کے مطلع کا شعر یہ ہے:

سرگزشتِ راہِ الفت کی کہوں گر داستاں
بھول جاوے سن کے رستم اس کو اپنے ہفت خواں

یہ قصیدہ ایک سو دو اشعار پر مشتمل ہے۔ پہلے مطلع کا آخری شعر سے قبل دوسرے شعر کا پہلا مصرع کاتب نے نہیں لکھا، مصرع ثانی یہ ہے:

دیدہ خورشید رہ وے تا قیامت خونچکاں

اس کے بعد کا جدول خالی ہے، اس میں کوئی عبارت مرقوم نہیں ہے ممکن ہے یہ مطلعِ ثانی ہو اس میں ستائیس شعر ہیں۔

اب اٹھا سکتا نہیں جور و جفائے آسماں
الاماں اے داورِ انصاف پرور، الاماں

اس کے بعد کا جدول بھی خالی ہے جو مطلعِ ثالث کے لیے ہے، جس پر اس شعر سے روشنی پڑتی ہے:

جی میں آتا ہے کہ اک وہ مطلعِ ثالث لکھوں
سن کے جس کو وجد میں آویں زمین و آسماں

اس قصیدے کا مطلعِ ثالث کا شعر یہ ہے:

مل گیا، خاکِ قدم (سے) تری کیا ان کو نشاں؟
دوڑے ہیں، حور و مَلک لے کے، خالی سُرمہ داں

قصیدہ (۲۳)

اس جدول میں آنے والی شعری تخلیق کی نشان دہی اس طرح کی گئی ہے: ''قصیدہ در منقبت شمعِ شبستانِ دینِ مصطفوی، حضرت امام نقی علیہ السلام''۔ اس کے مطلعے کا شعر یہ ہے:

گر اُلٹ دوں، شاہدِ معنی کے عارض سے، نقاب
دلبر کنعاں پہ چھڑکے، پیرِ کنعانی گلاب

اس میں کوئی مطلعِ ثانی نہیں ہے، یہ قصیدہ چھپّن شعروں پر مبنی ہے۔

قصیدہ (۲۴)

اس کے جدول میں یہ عبارت لکھی گئی ہے: ''قصیدہ در منقبت مظہرِ شانِ حیدری حضرت امام عسکری علیہ الصلوٰۃ والسلام''۔ اس قصیدے کا مطلع یہ ہے:

کچھ نہیں وہ نکتہ سنجی کچھ نہیں وہ شاعری
جب تلک ہو جے نہ عارف، مدح خوانِ عسکری

اس قصیدے میں کوئی مطلعِ ثانی نہیں ہے اور کل اشعار کی تعداد سو ہے۔

قصیدہ (۲۵)

اس کے جدول میں یہ عبارت دی گئی ہے: ''قصیدہ در منقبت حضرت امام دو جہاں حضرت مہدی ہادی امام آخر الزماں علیہ السلام''۔ اس قصیدے کا مطلع کا شعر یہ ہے:

یارب وہ ترا مظہرِ اَسرار کہاں ہے
موجود ہے عالم میں پہ آنکھوں سے نہاں ہے

اس میں کوئی مطلعِ ثانی نہیں ہے اور یہ ستر شعروں پر مشتمل ہے۔

قصیدہ (۲۶)

''قصیدہ در منقبت سیّد سالارِ لشکرِ ابرار حضرت عباس علی علیہ السلام''۔ اس کا مطلع یہ ہے:

ہے اہلِ محبت کو مزا درد و الم کا
یاں ذکر نہ کر انجمنِ عشرتِ جم کا

اس میں بھی کوئی مطلعِ ثانی نہیں ہے کل اشعار کی تعداد ستر ہے۔

قصیدہ (۲۷)

اس کے جدول میں یہ عبارت آئی ہے: ''قصیدہ در منقبت جگر گوشۂ امام حسین شبیہ رسول الثقلین حضرت علی اکبر علیہ السلام''۔ یہاں بھی کوئی مطلعِ ثانی نہیں ہے، اس میں اشعار کی تعداد کل اُنسٹھ ہے، اس کی زمینِ شعر میں ردیف 'نکلا' آئی ہے جس کی وجہ سے شعر گوئی کا مرحلہ مشکل ہو گیا ہے، اس کے مطلعے کا شعر یہ ہے:

میرے کاشانہ کی جانب سے وہ کیوں کر نکلا
گھر سے ہاں اُس کے عدو لڑ، کے مقرر نکلا

قصیدہ (۲۸)

اس قصیدے میں یہ عبارت آئی ہے: ''قصیدہ در منقبت نورِ دیدۂ امام حسین سیّد الشہدا جگر بندِ علی المرتضیٰ دُرِجِ امامتِ علی حضرتِ انور، علی اصغر''۔ اس کا مطلع یہ ہے:

دل مرا ہو کے لہو چشم سے بہتا کیوں کر
جل کے نالوں سے مرے جبکہ ہوا خاکستر

اس میں مطلعِ ثانی موجود ہے:

چوسنے میں جو ترے لب کا ہوا اس میں اثر
تری چُسنی ہے مسیحا کے لبوں سے بہتر

اس میں نئی بات یہ ہے کہ علی اصغر کے بچپن کا خیال کر کے کہ وہ دودھ پیتے بچے تھے، چُسنی کا ذکر آیا ہے، اس میں تریسٹھ شعر شامل ہیں اگرچہ تاریخی اعتبار سے اس زمانے میں بچے کی چُسنی کا رواج نہیں تھا اور نہ بوتلوں سے دودھ پلایا جاتا تھا لیکن انیسؔ و دبیرؔ نے شہیدانِ کربلا اور اہلِ بیت کو عرب سماجی پس منظر میں نہیں اودھ کے سماجی پس منظر میں پیش کیا ہے، اس لیے عارفؔ نے بھی یہ روش اختیار کی ہے۔

قصیدہ (۲۹)

اس کے جدول میں یہ عبارت درج ہے: ''قصیدہ در منقبت سروِ بوستانِ سیادتِ شمشادِ گلستانِ شہادت لختِ جگر امام ابن امام حضرت قاسم علیہ الرحمۃ''۔ اس کا مطلع یہ ہے:

کسی نے آن کے لوٹی ہے کیا بہارِ چمن
کرے ہے شور و فغاں رات دن ہزارِ چمن

اس میں کل شعروں کی تعداد چونسٹھ ہے اور اس کی ردیف چمن ہے، مطلعِ ثانی جو جدول میں لکھا گیا ہے اس کے تحت آنے والا مطلع یہ ہے:

زُلالِ لطف ترا ہو، جو آبیارِ چمن
بہارِ خُلدِ بریں ہووے پیش کارِ چمن

آخری شعر یہ ہے:

بیاں یہ کرکے لگی کہنے ایک غزل تجھ کو
سناؤں ایسے کہ جس میں ہیں حالِ زارِ چمن

اس کے بعد جدول میں غزل کا عنوان دیا گیا ہے اور پھر بارہ شعر آئے ہیں، جس کا مطلع ہے:

یہ رو رہی ہے پڑی چشمِ اشکِ بارِ چمن
جہاں میں جو کہ ہے مشہور آبشارِ چمن

غزل کے بعد اٹھارہ اشعار کا قطع ہے اور مقطع یہ ہے:

خزانِ حادثہ کا کچھ خطر نہیں عارفؔ
ربیع، لطف پہ، جب اس کے ہو، مدارِ چمن

چمن کی ردیف بھی قصائد کی ان ردیفوں میں ہے جن کی وجہ سے عارفؔ کے قصیدوں میں ایک خاص خوشگواری پیدا ہوگئی ہے۔

قصیدہ (۳۰)

''قصیدہ در مدح جناب قطب الدولہ شیخ الاسلام والمسلمین مولانا فخرالدین قُدّس رُوح'' کی مدح میں ہے، اس میں دو مطلعے ہیں، اس قصیدے کا پہلا مطلع یہ ہے:

تمام صفحے جو لفظوں سے ہوگئے پرویں
نہیں یہ شعر یہ ہے فیضِ مدحِ فخرالدیں

یہ قصیدہ مولانا فخرالدین کی تعریف میں ہے جو عہدِ محمد شاہی کے معروف بزرگوں میں سے تھے۔ میاں کالے صاحب، جن کے نام کی نسبت سے احاطہ کالے صاحب نام کا محلّہ اب بھی بلّی ماران میں ہے، وہ انھیں کی اولاد میں تھے۔ بہادر شاہ ظفر خود بھی اسی خاندان میں مرید تھے اور غالبؔ کے خسر عارفؔ کے نانا نواب الٰہی بخش معروفؔ بھی انھی سے نسبتِ روحانی رکھتے تھے۔ غالبؔ کی میاں کالے صاحب میں سکونت بھی رہی ہے۔

اس کے بعد مطلعِ ثانی ہے جو اُس کے بعد آنے والے جدول میں لکھا گیا ہے:

حبابِ قلزمِ وحدت ہیں اس میں اشک ہی نہیں
شہنشاہ یہ ترے دونوں دیدۂ یک بیں

یہاں اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ حضرت علی کے دو بیٹے ہیں امام حسن اور امام

حسین، یہ دونوں حضرت فاطمہ کے بطن سے ہیں، باقی بیٹے دوسری بیویوں سے ہیں، ان میں علوی بھی ہیں لیکن امامت حضرت امام حسن اور امام حسین کو ضرور ملی۔ حضرت امام حسن کی اولاد میں کوئی امام نہیں صرف امام حسین کی اولاد میں ہیں۔ اہلِ سنت والجماعت تمام اماموں کو جو تعداد میں بارہ ہیں، احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن ان کی ادارتی حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس پر بھی یہ عجیب صورت ہے کہ تمام مسلمان حضرت امام مہدی کے غائب ہونے اور قیامت کے قریب واپس آنے پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ مطلعِ ثانی اپنے لب و لہجے کے اعتبار سے کسی درویش مزاج اور فقیر منش بزرگ کے لیے نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ لفظوں کا تعلق معنی سے بھی ہوتا ہے اور اس معنوی فضا سے بھی جسے شاعر تخلیق کرنا چاہتا ہے، یہ قصیدہ پچھتر شعروں کو محیط ہے۔

قصیدہ (۳۱)

اس کے جدول میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: ''قصیدہ در مدحِ جناب سیادت مآب قطب العارفین سیّد المحققین واقفِ اسرارِ خفی و جلی حضرت سیّد''۔ اس کا مطلع یہ ہے:

گر خدا نے دی ہے تجھ میں استطاعت اس قدر
جا مدینہ کو نہ کر اندیشۂ طولِ سفر

اس میں کوئی مطلعِ ثانی موجود نہیں ہے اور اس شعر پر یہ قصیدہ ختم ہو جاتا ہے:

بے نمودی سے ہو تیرے دشمنِ جاں کی نمود
ہار تیرے دوستوں کا ہو زمانِ سیم بر؟

قصیدہ (۳۲)

یہ قصیدہ در مدحِ غالب بغیر کسی جدول کے شروع ہو جاتا ہے، اس کے مطلعے کا شعر یہ ہے:

مداد سے رہے تاریک تر، جہانِ سخن
جو طبع تیری نہ ہو، مہرِ آسمانِ سخن

یہ نسبتاً مختصر قصیدہ ہے اور بیالیس اشعار سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس قصیدے میں مطلعِ ثانی یا غزل کی فارم میں شامل اشعار نہیں ملتے، پہلے مطلعے کا آخری شعر ہے:

قصیدہ کو ہی سمجھ مت کہ دم بھر میں
غزل بھی میر (سے) بہتر ابھی کروں تحریر

قصیدہ (۴۳)

اس قصیدے میں بھی کوئی جدول یا تحریر موجود نہیں ہے، اس کی زمین قدرے مشکل ہے، اس میں 'آفتاب' بطور ردیف کے لکھا گیا ہے، یہ قصیدہ نواب ضیاء الدین احمد خاں کے لیے ہے جس کا اظہار قصیدے کے اس تیسرے شعر سے ہوتا ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں کا تخلص نیر تھا اور نیر آفتاب ہی کو کہتے ہیں:

نامِ نامی ہے ضیاء الدین احمد خاں ترا
نام سے ہی تیرے پیدا ہے نشانِ آفتاب

اس قصیدے میں بھی کوئی مطلعٔ ثانی نہیں ہے، اشعار کی کل تعداد پینتالیس ہے۔

قصیدہ (۴۴)

اس قصیدے کے جدول کو اس عبارت سے آراستہ دیکھتے ہیں: ''قصیدہ در مدحِ شہنشاہِ عرش بارگاہِ انجم سپاہ ابوالمظفر محی الدین محمد اکبر شاہ بادشاہِ غازی خَلَدَ اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ''۔ اس قصیدے کے مطلعے کا شعر اس طرح ہے:

میرے کلام میں بخشی ہے حق نے وہ تاثیر
کہ سر ہلائے جسے سن کے پیکرِ تصور

مطلع:

ہنسے نہ کیوں میری غفلت پہ کاتبِ تقدیر
کروں ہوں یار کے ملنے کی رات دن تدبیر
شب فراق میں رہوے یہ جب کہ تاریکی
تو پاوے راہِ فلک کیوں کہ نالۂ شبیر
ہوئی ہے نام سے آزادگی کے کیا نفرت

....

اس کے بعد جدول میں غزل کا عنوان لکھا ہوا ہے اور اس کے تحت گیارہ شعر آئے ہیں، غزل کے بعد قطع ہے:

وہ کون خسروِ عالم محمد اکبر شاہ
کہیں جہان میں جس کا کوئی نہیں ہے نظیر

غزل کا مقطع یہ ہے:

نتیجہ فنِ سخن کا ہمیں نہ تھا عارف
کرے نہ مِدحتِ شاہِ زمن اگر تحریر

اس میں مطلعِ ثانی کا اندراج عمل میں نہیں آیا لیکن مطلعِ ثالث جدول میں لکھا گیا ہے اور اس کے تحت یہ شعر آیا ہے:

شاہ میں کیا کہوں کس پائے کا ہے ترا سریر
کہیں نہ مدح کے ہو ذم لکھوں جو عرشِ نظیر

اس قصیدے میں شعروں کی کل تعداد اُناسی ہے۔

قصیدہ (۳۵)

اس کے جدول میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: ''قصیدہ در مدحِ شہنشاہ سلیمان جاہ کیواں، بارگاہِ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی''۔ اس کا مطلع یہ ہے:

ہو گُلِ داغِ جنوں اب گر عیاں بالائے سر
رہوے وحشت میں بہارِ بے خزاں بالائے سر

اس مطلعے کا آخری شعر ہے:

اس زمیں میں ہم کو عارف اک سُنا رنگیں غزل
آج کیا ہے یہ ترے ہر گرد زباں بالائے سر

حاشیہ:

قصیدہ ۲۲: ہفت خواں ایک ادبی تلمیح ہے اور یہ تلمیح ایرانی روایات میں سے ہے کہ رستم نے سات مہمات کو سر کیا۔

قصیدہ ۳۴: عارف کی پیدائش ۱۸۱۷ء میں ہوئی اور اکبر شاہ ثانی کا انتقال ۱۸۳۷ء میں ہوا، جس کے یہ معنی ہیں کہ بادشاہ کے انتقال کے زمانے تک عارف کی عمر صرف بیس برس تھی اور چوں کہ یہ قصیدہ بادشاہ کی زندگی میں لکھا گیا اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ قصیدے کی نگارش کے وقت ان کی عمر اور بھی کم ہو۔ ایسی صورت میں یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ قصیدہ عارف کا نہیں ہے اور اس میں کسی دوسرے شخص نے، وہ غالب بھی ہو سکتے ہیں، ان کی مدد کی ہو۔

اس کے بعد جدول میں غزل تحریر ہے، اس کے تحت پندرہ شعر آئے ہیں، غزل کا مطلع ہے:

بسکہ اشکوں کا ہے اک دریا رواں بالائے سر
تیرتی پھرتی ہیں میرے مچھلیاں بالائے سر

اس غزل کا مقطع یہ ہے:

یہ زمیں ہے آسماں سے کم نہیں اس کی ردیف
جس کو رکھے عارفؔ جادو بیاں بالائے سر

غزل کے بعد قطع ہے، اس قصیدے میں کوئی مطلعِ ثانی نہیں ہے، اشعار کی کل تعداد ننانوے (۹۹) ہے۔

سلام کی تعریف

سلام مذہبی نظمیں ہوتی ہیں، اس کے علاوہ وہ مسلسل غزل جن میں واقعاتِ کربلا سے وابستہ کرداروں کی توصیف ہوتی ہے، سلام کہلاتی ہے۔ اس طرح کی نظمیں مولود شریف میں عام طور پر پڑھی جاتی ہیں۔ سلام اپنے غیاب میں بھی پہنچایا جاسکتا ہے اُن سے میرا سلام کہنا۔ خطوں میں بھی سلام لکھا ہوتا ہے۔ یہ آداب وتسلیمات کے دائرے میں آتا ہے۔ جو سلام بطور نذرانہ عقیدت پیش کیا جاتا ہے وہ عام طور پر کھڑے ہوکر پیش کرتے ہیں اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ حضرت رسول مقبول کا ذکر مقدس آتا ہے تو آپ ہی وہاں اپنے نورانی وجود کے ساتھ موجود ہوتے ہیں اسی لیے سلام پیش کرنے والے کھڑے ہوکر سلام پیش کرتے ہیں۔ جو لوگ/شعرا عام طور پر مرثیہ نہیں لکھتے وہ سلام لکھتے ہیں۔ ان میں اہم نام خود انیس ودبیر، انیس کے نواسے اور جانشیں پیارے صاحب رشیدؔ اور ان کے ہم عصر جاوید سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

سلام (۱)

اس کے جدول میں کوئی عبارت نہیں دی گئی ہے، اس کے مطلع کا شعر یہ ہے:

مُجرِی حیرت میں کیا ہے چشمِ تر کھولے ہوئے
اُٹھ عزاداروں میں جا سرور کے سر کھولے ہوئے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک سلام ہے جو کہ اکیس شعروں پر مشتمل ہے۔

سلام (۲)

اس کے جدول میں کوئی عبارت یا عنوان موجود نہیں ہے اور مطلع اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ ایک سلام ہے۔ اس میں ستائیس شعر شامل ہیں۔

اے مُجرِیِ یزید، بد اختر کو دیکھیے
اور نورِ چشمِ ساقیِٔ کوثر کو دیکھیے

سلام (۳)

اس کے جدول میں بھی کوئی تحریر موجود نہیں اور اس کے مطلعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک سلام ہے، یہ شعری تخلیق انتیس شعروں پر مشتمل ہے۔

قیصر کے سامنے نہ سکندر کے سامنے
جھک مُجرِئی سلام کو اُس در کے سامنے

سلام (۴)

اس کے جدول کی بھی یہی صورت ہے اور اس میں بھی کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔ مطلعے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ بھی سلام ہے:

جدا ہے دیکھیے گر مجریِ لقائے حسین
کہ یہ تمام خدائی ہے رونمائے حسین

یہاں ردیف حضرت امام حسین کا اسمِ مقدس آگیا ہے اور یہ بھی ایک قابلِ یادداشت بات ہے کہ بطورِ ردیف حضرت امام حسین کا نام لایا گیا ہے۔ اشعار کی تعداد صرف سولہ ہے۔

عارفؔ کے کلیات کی جلدِ اول میں قصائد کی کل تعداد پینتیس ہے اور سلاموں کی تعداد کل چار ہے اور ان کا آغاز غزل کی طرح مطلعے سے ہوتا ہے کہ ان کی فارم بھی غزل ہی کی شعری ہیئت ہے جو سلاموں کی اکثر ہوتی ہے۔ لیکن ان کے ساتھ کوئی اندراج بطورِ عنوان یا تحریری عنوان نہیں ہے اس کے بعد کی شعری تخلیقات میں دوسری ہیئتوں کے ساتھ عزائی شعر تحریر ہوئے ہیں۔

زیادہ تر قصائد حضرت امام حسین یا بعض دوسرے اماموں کی منقبت میں ہیں۔ ان میں صرف پانچ قصیدے ایسے ہیں جن میں سے ایک حضرت مولانا فخرالدین، دوسرا غالب

اور تیسرا نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تعریف میں، چوتھا بہادر شاہ ظفر اور پانچواں اُن کے والد اکبر شاہ ثانی کی مدح و ثنا میں ہے۔ یہ صورتِ حال بھی لائقِ فکر اور قابلِ توجہ ہے کہ عارفؔ کی قصیدہ نگاری میں ممدوحین کون لوگ ہیں اور انھوں نے اپنی جوان العمری میں اگر قصیدے انشا کیے تو وہ کن افراد کے لیے تھے اور اس اعتبار سے وہ غالبؔ سے بہت کچھ مختلف نظر آتے ہیں۔

مخمس

مخمسات کا ایک طویل سلسلہ ہے جو قصائد کے ذیل میں یا ان کے ساتھ آتا ہے۔

پہلا مخمس اس بند سے شروع ہوتا ہے:

کیوں کر کوئی اس وقت میں، سَرور سے جدا ہو
شرمندہ وہ حق سے ہو پیمبر سے جدا ہو
گو باپ سے ہو دور کہ مادہ سے جُدا ہو
حُر کہتا تھا سر مُجری تن سے جُدا ہو

اور اس ترکیب بند کا مصرعہ جو پہلے بند کے بعد آیا ہے وہ یہ ہے:

''شبیر کا سایہ نہ میرے سر سے جدا ہو''

یہ سب مخمسات ترکیب بند کی فارم میں ہیں اور ان کی کل تعداد چونسٹھ ہے۔

ہر بند اور اس کا ترکیب بند کو ظاہر کرنے والا مصرعہ جدول میں لکھا گیا ہے، اس کے بعد ایک جدول موجود ہے لیکن تحریر سے محروم ہے، پہلا بند یہ ہے:

عجب نہیں ہے کہ ہر دل جو پیچ و تاب میں ہے
بدن میں جان ہے جس جا سو اضطراب میں ہے
ہمیشہ لختِ جگر دیدۂ پُر آب میں ہے
ہر ایک (ذرہ) کب اے مُجری حساب میں ہے

اور ترکیب بند کا مصرعہ یہ ہے:

''کہ سوزِ ماتمِ شبیر آفتاب میں ہے''

اس کے بعد کے جدول میں کچھ بھی تحریر نہیں ہے اور اس سے نیچے یہ شعر آیا ہے:

بہے جو خون کے آنسو تو گُل عذار ہوئے
ہوئے ہیں غیرتِ گل جب سے دل فگار ہوئے

ترکیب بند کی ٹیپ یہ ہے:

سلامی شاہ کے غم میں جو اشک بار ہوئے
گہر سے بھی گہر اشک آب دار ہوئے

یہ مسدس کی فارم میں ہے اور ترکیب بند اپنی تعداد کے اعتبار سے انیس ہیں۔ٹیپ کا شعر ہر بند میں مختلف ہے لیکن اسی زمین میں ہے۔اس کے بعد کی جدول خالی ہے اور اس کے نیچے دو مختصر مرثیے ہیں، پہلے مرثیے کا مطلع کا شعر یہ ہے:

کیا کیا، تو نے فلک حضرتِ شبیر کے ساتھ
یوں نہ کرنا تھا تجھے اس شہِ دلگیر کے ساتھ

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غزل کی فارم میں یہ سلام ہی ہے۔اس کے بعد کے جدول میں بھی کچھ تحریر نہیں ہے۔اس نوحہ کا پہلا شعر یہ ہے:

اے فلک برباد مت کر خانمانِ فاطمہ
کیوں مٹاتا ہے جہاں سے تو نشانِ فاطمہ

اس نوحے میں کُل سترہ شعر ہیں، اس کا مقطع یہ ہے:

ممبرِ مُہ رُتبہ افلاک کا وارث ہوا
جب سے میں عارف ہوا ہوں مدح خوانِ فاطمہ

اس کے بعد کا جدول بھی بہ دستور خالی ہے، جو شعری تخلیق درج ہوئی وہ ایک ترجیع بند ہے، جو مسدس کی شکل میں ہے۔پہلا مسدس ۱۴ بندوں پر مشتمل ہے اور سلام ہے۔پہلا شعر یہ ہے:

چرخ پر حور و ملائک اور زمین پر اِنس و جن
یہ عبادت جانتی ہے کیا جواں اور کیا مُسِن

ترجیع بند کا شعر یہ ہے:

السلام! اے گلبنِ باغِ شہادت السلام
السلام اے اخترِ بُرجِ سعادت السلام

یہ بند اپنی تعداد کے اعتبار سے کل چودہ ہیں۔اس کے بعد کے جدول میں یہ عبارت درج

ہے: ''ترجیع بند در منقبت جناب سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام''۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

شاہ برکت ہووے جہاں ترے قدم کی
واں قدر نہیں خاک گلستانِ اِرم کی

اس کا ہر بند نو شعروں پر مشتمل ہے اور آخری شعر ترجیع بند ہے، اس طرح ان شعروں کی تعداد دس ہے۔ یہ ترجیع بند تعداد میں کل تینتالیس ہیں۔ ہر بند میں نو بیتیں ہیں، پہلی بیت مطلع ہے۔ اور ٹیپ کی بیت یہ ہے:

سر، پاؤں پہ جس کے رہے ہر ایک ولی کا
وہ رُتبۂ عالی ہے، حسین ابنِ علی کا

اس کے بعد کے جدول میں یہ عبارت آئی ہے: ''ترجیع بند در مدح جناب قطب الخطاب حضرت مولانا محمد فخر الدین قدّس سرّہٗ''۔ اس میں ہر بند میں کل نو شعر آئے ہیں اور آخری شعر ترجیع بند ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے:

جیتے جی وہ جو رہِ حق میں فنا ہوتے ہیں
چاشنی گیرِ ئے صد جام بقا ہوتے ہیں

اس کی ہیئت بھی ماقبل کے ترجیع بند کی ہے۔ ٹیپ کی بیت یہ ہے:

فخر دیں مہبطِ انوارِ الٰہی مددے
معنی کاشفِ اسرارِ الٰہی مددے

ان کی کل تعداد چودہ ہے۔ اس کے بعد جو جدول آیا ہے وہ بھی تحریر و نگارش سے محروم ہے۔ یہ ہر بند نو شعروں پر مشتمل ہے اور ترجیع بند ٹیپ کی بیت یہ ہے:

ہوں رندِ بلا نوش یہ قصہ ہے کہاں کا
ساقی مجھے کیوں ہول ہے ماہِ رمضاں کا

ان میں کل آٹھ بند ہیں، یہی صورت اس کے بعد کے جدول کی بھی ہے کہ وہ کسی نگارش یا تحریر سے آزاد و محروم ہے۔

مطلع: ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمری بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شری بینم

ترکیب بند اسی زمینِ شعر کے مختلف شعروں پر مشتمل ہے اور ہر بند کی سلسلہ بندی سات شعروں سے ہوئی ہے، ان بندوں کی کل تعداد سات ہے جس کے معنی ہیں کہ انچاس شعر ہفت بند سے تعلق رکھتے ہیں اور سات ہی شعر ترکیب بند کے طور پر آئے ہیں۔ یہ ترجیع بند حافظ کی ایک غزل کی تضمین ہے اور پہلے ٹیپ کی بیت کا مطلع ہے۔

اس کے بعد کی جدول بھی سادہ و بے تحریر ہے اور ہر بند میں نو شعر اس شعر کے علاوہ ہیں جو ٹیپ کے شعر طور پر تحریر ہوا ہے:

جس کو ہمیشہ شاد و طرب ناک دیکھیے

اُس پر پڑی ہوئی یہ منوں خاک دیکھیے

تعداد میں کل بند دس ہیں، آخری ترکیب بند کے شعر سے پہلے یہ شعر آیا ہے جو عارفؔ کے تخلص سے مزین ہے۔ ٹیپ کی بیتیں کسی ایک زمین میں نہیں ہیں:

ہوکر فقیر بیٹھیے مجنوں کی قبر پر

لازم ہے اب جہاں سے عارف اٹھاؤ ہاتھ

اس کے بعد کا جدول بھی خالی ہے مگر یہ مخمس کی فارم میں ہے۔ پہلے بند کے بعد آنے والا مصرعہ یہ ہے:

جو شرر دل سے اٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے

یہ مخمس غیر معمولی طور پر طویل ہے اور ایسے مرثیوں کی یاد دلاتا ہے جو طویل الذیل کے ضمن میں آتے ہیں اور اس میں موجود بند اپنے نشان شمار کے لحاظ سے نوے ہیں۔ یہ ترجیع بند حافظ کی ایک غزل کی تضمین ہے اور پہلے ٹیپ کی بیت کا مطلع ہے۔ اس کے بعد حالی نے تو باقاعدہ ایک مسدس 'مدو جزر اسلام' کتابی صورت میں لکھ ڈالا اور آخری بند میں مقطع ہے۔ اس کے بعد کا ترکیب بند تحریر سے بھی محروم ہے اور جدول سے بھی۔ اس ترکیب بند کا پہلا بند یہ ہے:

اس طرح میں تو کبھی نقش بہ دیوار نہ تھا

دیکھنا سوئے فلک رنج میں سو بار نہ تھا

چشم حیران نہ تھی نالہ شرر بار نہ تھا

جب تلک زلف میں دل اس کی گرفتار نہ تھا

سرِ مدعم سے کبھی مجھ کو سروکار نہ تھا

اس ترکیب بند میں شامل بند اپنی تعداد کے اعتبار سے نو ہیں۔ غزل کو مخمس کی فارم میں تضمین کیا ہے۔

جدول میں جو عبارت آئی ہے اس میں غلطی سے 'مثنوی' بہ 'سینِ' مہملہ لکھی ہوئی ہے[1]، مثنوی کا عنوان بھی بہ خط غیر معلوم ہوتا ہے۔ مسدس بہ خطِ غیر لکھا ہوا ہے۔ یہ کاتب کا قلم نہیں معلوم ہوتا:

آج موتی، جو کلکِ گوہر بار　　آپ اپنے پہ (جو) کرے ہے نثار

پہلے معمول تھا یہ کب اس کا　　ہم کو معلوم ہے سبب اس کا

اس مثنوی کے سینتیس شعروں کے بعد غزل ہے۔ مطلع یہ ہے:

یا الٰہی یہ کیا ہوا مجھ کو　　لگ گئی کس کی بددعا مجھ کو

غزل کے اشعار کی تعداد تیرہ ہے، مقطع یہ ہے:

جب سے کرنے لگا ریا عارف

لوگ کہتے ہیں پارسا مجھ کو

اس غزل کے بعد پھر مثنوی کے اشعار آئے ہیں جن کی تعداد اکتالیس ہے اور آخری شعر جو عارف تخلص کے ساتھ آیا ہے، وہ یہ ہے:

ہرزہ گوئی پہ کھینچ عارف خط

ختم کر نامہ جلد لکھ کے فقط

اس کا یہ مطلب ہے کہ اس مثنوی کو عارف نے 'نامۂ شوق' کے عنوان سے لکھا ہے۔

دیوانِ دوم (قطعات)

عارف کی اردو کلیات یا دیوانِ دوم میں غزلوں کے خاتمے پر قطعات بھی درج کیے گئے ہیں، ان میں ایسے قطعات جو دو شعروں پر مشتمل ہیں ان کی تعداد اڑتیس ہے۔ تین قطعے ایسے ہیں جن میں اشعار کی تعداد تین ہے۔ ایسے قطعات بھی ہیں جن میں ابیات کی تعداد چار یا پھر اور زیادہ ہے۔ زیادہ شعری تعداد والے قطعات زیادہ تر مدح و ستائش سے متعلق

---

1. پرانے مخطوطوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن میں مثنوی 'ث' کے بجائے 'سین' سے ہے۔

ہیں۔ غالب کی فارسی شاعری میں بھی جیسا کہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے راقمہ کو بتایا، ایسے طویل قطعات اچھی خاصی تعداد میں ہیں جو مدح وستائش پر مشتمل ہیں، اب غالب کا تو ایک رویہ یہ بھی تھا کہ وہ قصائد کے ساتھ ایک قطعہ بھی شامل کر لیتے تھے۔ ممکن ہے عارف نے اردو میں یہ روش غالب کی تقلید ہی کے طور پر اختیار کی ہو، اس لیے کہ اردو میں عارف کے زمانے تک جو قطعہ نگاری ملتی ہے وہ اس نوع کی ستائش گری پر مشتمل نہیں ہے۔ بہر حال یہ عارف کا ایک ایسا انداز ہے جس میں ان کے ساتھ غالب بھی شریک ہیں بلکہ شریکِ غالب ہیں۔ یہاں عارف کے بعض مختصر قطعات کو جو دو شعروں پر مشتمل ہیں، انتخابِ کلام کے ایک جز کے طور پر شامل کیا جا رہا ہے۔

قطعہ (۱)

سب سے تم محترز رہو عارف — گو کہ دم دوستی کا بھرتے ہیں
یہ ہیں وہ لوگ کھاتے ہیں جس میں — اس رکابی میں چھید کرتے ہیں

قطعہ (۲)

اس مہماں سرا میں عارف قیام کب تک — غفلت پر آپ اپنی ہم دنگ رہ گئے ہیں
پتھر ہے وزن اپنا میزانِ زندگی میں — دھڑیاں تو ٹل گئی ہیں پاسنگ رہ گئے ہیں

قطعہ (۳)

یاں کام ہوا، اپنا نہ کوئی دل خواہ — جو راہ چلے ہم سو چلے وہ بے راہ
اب جی میں یہ آتا ہے کہ کیجے عارف — اک زاویے میں بیٹھ کے اللہ اللہ

قطعہ (۲): پانچ سیر وزن کو دھڑی کہتے ہیں۔ اردو میں کہاوت ہے دھڑیاں ٹل گئیں پاسنگ رہ گئے۔ قطعے کے آخری مصرعے میں عارف نے اسی کہاوت کو نظم کیا ہے اس سے پہلے قطعے میں آخری مصرع اس کہاوت پر مشتمل تھا جس میں کھاتے ہیں اسی میں چھید کرتے ہیں۔ یہ ایسے لوگوں کے لیے کہا جاتا ہے جو نمک حرام ہوتے ہیں اور اپنے محسنوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔

قطعہ (۳): یہ قطعے کا وزن نہیں رباعی کا ہے۔ آہنگ کے اعتبار سے بھی اور ہیئت کے اعتبار سے بھی اس کو رباعیات میں شامل ہونا چاہیے تھا۔ زاویے کونے کو کہتے ہیں اور صوفیوں کے یہاں ایک گوشے میں زندگی گزارنے کا تصور ہوتا ہے اسی لیے وہ اپنی قیام گاہ کو زاویہ کہتے ہیں اور خود زاویہ نشین کہلاتے ہیں۔

قطعہ (۴)

جس کی کہ ترے حسن پہ پڑتی ہے نگاہ — بے ساختہ کرتا ہے وہ دل سے ایک آہ
اچھے تو ہمیشہ ہی سے تم لگتے ہو لیکن — کچھ اور ہی اب روپ ہے ماشاء اللہ

قطعہ (۵)

بے خبر مت کدۂ دل سے نہ رہیو عارف — ڈر ہے اس کو نہ کہیں غم ہے سراپا ڈھاوے
قصہ مشہور ہے لختِ جگرِ آذر کا — گھر کا بھیدی نہیں کچھ دور کہ لنکا ڈھاوے

قطعہ (۶)

اٹھا کر آنکھ کب وہ دیکھتے ہیں — اگر کہیے تو دکھلاتے ہیں ابرو
انھوں کی اس ادا میں رمز ہے یہ — براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو

قطعہ (۷)

ان کا گھر اپنا گھر سمجھتا ہوں — نہیں آتا تو کچھ نہ آوے ہاتھ
یہ وہی ہے کہ گھر تمھارا ہے — کوٹھی کٹھلے کو مت لگاؤ ہات

قطعہ (۸)

آوے نظر کسی کو غمِ عشق کس طرح — جب درمیاں (میں) تنِ لاغر کی آڑ ہے
اس بات کو سمجھتے ہیں عارف دقیقہ رس — سوچو ذرا تو تنکے کی اوجھل پہاڑ ہے

قطعہ (۴): اس قطعے کا وزن بھی رباعی ہی کا وزن ہے۔ یہ بھی قطعہ نہیں رباعی ہے۔

قطعہ (۵): آخری مصرعہ اردو کی مشہور کہاوت ہے 'گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے'۔ یہی اس موقع پر نظم کی گئی ہے۔

قطعہ (۶): قدیم زبان کا اثر 'انھوں کی' لفظ میں موجود ہے، آخری مصرع فارسی کی مشہور مثل ہے، جس کو یہاں بے تکلف نظم کیا گیا ہے۔

قطعہ (۷): یہاں بھی آخری مصرع اردو کی مشہور کہاوت پر مشتمل ہے، گھر تمھارا ہے مگر کوٹھی، کٹھلے کو ہاتھ مت لگانا۔ دونوں مصرعوں میں ردیف ہاتھ ہے۔

قطعہ (۸): اس کا آخری مصرع بھی اردو کی ایک معروف کہاوت ہے جسے تل کی اوٹ پہاڑ بھی کہتے ہیں۔ اور تنکے کی اوجھل پہاڑ بھی۔ عارف نے دوسری صورت میں اس کہاوت کو لیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں 'میرے تن لاغر کی آڑ ہے'۔

قطعہ (۹)

تھوکوں ہوں میں جو خونِ دلِ تفتہ ہجر میں	سوزاں تھا بسکہ مجھ کو سراپا جلادیا
آئے ہے خوف اب تو مجھے ہر سرشک سے	بیوی نے چھاج پھونک کے کودوں جلادیا

قطعہ (۱۰)

عارضِ صاف پہ دل اس کے گیا تھا اپنا	دیکھ کر خط کی سیاہی کو تو دوڑا آوے
سچ تو یہ ہے اُسے بھولا نہیں کہتے عارف	شام کے وقت اگر صبح کا بھولا آوے

قطعہ (۱۱)

مدت سے دردوغم میں تھا رنگ زرد میرا	پر جوشِ خوں سے ہونا اس کو نہ لال آیا
تھا شوقِ قتل کس کو اس لاغری میں قاتل	باسی کڑی کو شاید پھر سے اُبال آیا

قطعہ (۱۲)

طالبِ غم نہیں کوئی مجھ سا	یہ جو لائق ہے مجھ کو سو کہا ہے
غمِ دارین کی حقیقت کیا	اونٹ کے منہ میں جیسے زیرا ہے

قطعہ (۹): یہ قطعہ اس معنی میں بہت اہم ہے کہ یہاں زبان و بیان میں حضرت امیر خسرو سے منسوب شاعرانہ رویہ اپنے خوب صورت عکس کے ساتھ موجود ہے، خاص طور پر آخری مصرعے میں جہاں ایک دیہاتی کہاوت آئی ہے۔ 'کودوں' مشرقی یوپی میں ایک بہت ہی معمولی قسم کا اناج ہوتا ہے جسے ہم یہاں جوار اور باجرے سے مشابہ کہہ سکتے ہیں، اس کو جلانے کے لیے بیوی نے چھاج پھونک دیا۔ چھاج تیلیوں کا بنا ہوا وہ پھٹکنا ہوتا ہے جس میں اناج کو پھٹک کر صاف کیا جاتا ہے، اب سے کچھ زمانے پہلے تک چھاج گھر گھر میں ہوا کرتے تھے اور انھیں سے گھر کے اناج کو پھٹک کر صاف کیا جاتا تھا، اس اعتبار سے عارف کا یہ قطعہ نمونے کا قطعہ ہے کہ اس میں مشرقی یوپی کی کہاوت کو مصرعۂ آخر میں جوں کا توں باندھ دیا گیا ہے۔ عارف کی شاعری کا یہ وہ پہلو ہے جس کی طرف اس سے پہلے شاید اشارہ بھی نہیں کیا گیا۔

قطعہ (۱۰): اس میں دو باتیں نوٹ کرنے کے لائق ہیں، ایک یہ کہ عارف کہیں کہیں اپنے قطعات میں بھی اپنا تخلص لاتے ہیں جیسا کہ اس قطعے میں ہوا ہے، یہاں بھی انھوں نے ایک کہاوت نظم کی ہے مگر وہ صرف خیال کے اعتبار سے ہے لفظیات کا تانا بانا بڑی حد تک ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، کہاوت یہ ہے کہ ''صبح کا بھولا شام کو لوٹ آوے تو اُسے بھولا نہیں کہتے''۔

قطعہ (۱۱): آخری مصرعے میں 'باسی کڑی میں اُبال آنے کی' کہاوت شامل ہے۔

قطعہ (۱۲): 'اونٹ کے منہ میں زیرا' بھی کہاوت ہے۔

قطعہ(۱۳)

ہم نشیں غیرتِ گلزار ہو دامن کس کا — ایک... نہیں سرخ (کسو) کا آنسو
رات دن خونِ جگر چشم سے بہتا ہے مری — یار نے مجھ کو رُلایا ہے لہو کے آنسو

قطعہ(۱۴)

قصد سے روؤں تو طوفان بپا ہو (ہرسو) — دشت تو کیا کہ پہاڑوں پہ ہو بانسو(ں) پانی
مژہ مژہ کبھی بے قصد جو بل جاتے ہیں — 'طرفۃ العین' برس جائے ہے چھاجوں پانی

قطعہ(۱۵)

ہم ہی کچھ پاتے ہیں کب اُس سے وہ پکا ہو تو ہو — بات گھبرانے کی کیا ہے، ہے اگر عیّار یار
کیا ہوا، گراب کے کول وہ لے گیا ہے (دلفریب) — کاٹ کی ہانڈی نہیں چڑھتی ہے عارف بار بار

قطعہ(۱۶)

ہے جو منظور گرم بازاری — در دکان خود نمائی کھول
ورنہ یہ تو وہی کہاوت ہے — گھر میں گھوڑا ہے اور نہ خاس میں مول

قطعہ(۱۷)

یہ حال ہوا ہے جو زبوں میرے عدو کا — کچھ شک نہیں تاثیر ہوئی میری دعا کی
جو مار پڑی اُس پہ وہ کیوں کر کوئی سنتا — آواز نہیں ہوتی ہے لاٹھی میں خدا کی

قطعہ(۱۳): لہو کے آنسو رُلانا محاورہ ہے وہ یہاں خوب صورتی سے باندھا گیا ہے مگر یہ اُس دور کی عام روش ہے۔

قطعہ(۱۴): یہاں ایک بار پھر اس طرف توجہ دلائی جائے کہ اردو میں اس التزام کے ساتھ قطعے نہیں لکھے گئے کہ زبان کے وہ ٹکڑے محفوظ ہو جائیں جو گفتگو میں تو آتے ہیں مگر شعر و سخن میں ان کا عمل دخل کم ہی ہوتا ہے۔ 'طرفۃ العین' کے معنی پلک جھپکنا ہے جو بہت ہی مختصر مدت کو کہتے ہیں۔

قطعہ(۱۵): آخری مصرعے میں جو کہاوت آئی ہے وہ اس قطعے کو قابلِ توجہ بنا دیتی ہے کہ اس میں عارف نے خود کہاوت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قطعہ (۱۸)

رنج کچھ اُس کا نہیں، دانستہ، اعدا نے، اگر صورتِ نقشِ قدم پامال مجھ کو کر دیا
در سے کب اُٹھتا ہوں تیرے سخت جو کچھ ہو کہو ڈر ہے پھر دھمکوں سے کیا جب اوکھلی میں سر دیا

قطعہ (۱۹)

کبھی کہتے ہیں جو اشعارِ شیریں دل اُس (کے) رنگ کو تو جاں پھیکا
تعلّی پر انھوں کی کہیے عارف دُکاں اونچی ہے اور پکوان پھیکا

ان قطعات میں جو طویل قطعات ہیں ان میں جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے دو قطعے تین تین شعروں پر مشتمل ہیں۔

'عجائب لوگ ہیں دہلی میں عارف' اس مصرعے سے جو قطعہ شروع ہوتا ہے وہ چھ شعروں کو محیط ہے۔ قطعات کے عنوان سے ایک طویل قطعہ لکھا گیا ہے جس کا وزن اور زمین اس مصرعے سے متعین ہوتی ہے:

'کام میں، میرے، اس قدر اہمال'

یہ قطعہ اٹھارہ شعروں پر پھیلا ہوا ہے جو اس شعر پر ختم ہوتا ہے:

اب تو آنے سے شرم آتی ہے
یعنی صورت فقیر کی ہے سوال

'اس بزرگی کی کچھ نہایت ہے' اس زمین میں کہے جانے والا قطعہ سترہ شعروں کا احاطہ کرتا ہے، اس قطعے کا انتخاب یہ ہے:

قبلۂ جان و دل، ترا فدوی تجھ کو کہویں، برا یہ طاقت ہے
اسداللہ نام ہے تیرا اس بزرگی کی کچھ نہایت ہے
ورد نام بزرگ کا تیرے اس میں کچھ شک نہیں عبادت ہے
حقےَ سب پر کیا تجھے غالب تجھ سے روکش ہو کس کی طاقت ہے
مجھ کو زیبا ہے جتنا ناز کروں مجھ پہ جب یہ تری عنایت ہے

قطعہ (۱۸): عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اوکھلی میں سر دیا تو موسل سے کیا ڈر۔ یہاں عارف نے موسلوں کی جگہ دھمکوں استعمال کیا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ دہلی میں یہ کہاوت اس طرح بھی رائج تھی مگر کہاوتوں کا لفظی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہونا نئی بات ہے۔

عرض کرتا ہوں شکوۂ حساد　　گرچہ میرے خلاف عادت ہے
وہ سبب میں بیان کرتا ہوں　　ان کی جس وجہ سے یہ شرارت ہے
فیضِ صحبت (سے) تیرے، تیرا غلام　　جو بدلِ قابلِ امامت ہے
ان کی کیا کیا صفت کروں تحریر　　ایک آفت ہے اک قیامت ہے

آخری شعر یہ ہے:

ہیں یہ سارے جہان کے جھوٹے
قول کی ان کے کب صداقت ہے

اس کے بعد پندرہ شعروں پر مبنی قطعہ آتا ہے جس میں فارسی کا یہ مصرع جوں کا توں آخری شعر میں تضمین کیا گیا ہے:

توقع یہ نہ تھی عارف کو ہرگز تم سے، مشفق سے
چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اس کے بعد کا قطعہ پانچ شعروں پر مشتمل ہے، بعدازاں رباعیات کا عنوان قائم کیا گیا ہے مگر یہ قطعات ہیں۔ اور رباعیات لکھ کر دو شعروں کے بعد کہ وہ بھی قطعے ہیں، بعد میں پھر قطعے کے عنوان سے قطعات دیے گئے ہیں۔ رباعیات کے عنوان کے تحت جو چار مصرعے ہیں:

ہر چند ایسے شخص کی کیا کھینچ سکے شبیہ　　عاشق کا دل ز بسکہ مگر ناصبور ہے
ایک اپنے اعتقاد میں ہر وقت سامنے　　تصویرِ یار بہر تسلی ضرور ہے

اس کے بعد ایضاً یعنی قطعے کے تحت جو کلام ہے وہ پانچوں رباعیاں ہیں:

(۱)　بے ہوش پڑا رہتا ہوں میں شام و پگاہ
(۲)　ہرگز نہ بتوں سے کیجو تو عارف چاہ
(۳)　کتنا ہی کہا پر میرا کہنا نہ کیا
(۴)　ارمان کسی کا نہ نکلتے دیکھا
(۵)　تا چند گنیں جائیں کو کب یارب　　آخر نہ ہوئی فراق کی شب یارب
　　عالم میں کبھو نہ کوئی سونے پایا　　تا حشر کہا میں نے جو یارب یارب

یہ رباعی نہیں (۱) وزن ہے مفعول، فاعلات، مفاعیلُ فاعلن (۲) پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع مقفّیٰ مردّف نہیں۔
اس کے بعد قطعہ کے تحت پانچ قطعے ہیں۔

اس کے بعد ایک قطعہ ہے پھر رباعیوں کے عنوان کے تحت چار مصرعوں کے تین قطعے ہیں لیکن ہر ایک پر رباعی کا عنوان ہے۔ اور اس طرح گیارہ قطعات یہاں درج کیے گئے اور ان میں بھی کم وبیش یہی اہتمام موجود ہے کہ کوئی کہاوت، مقولہ درج کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس قطعے سے ہوسکتا ہے:

بے ہوش پڑا رہتا ہوں، میں شام و پگاہ
شاکی ہے بہت مجھ سے، میرا غیرتِ ماہ
کس وقت وہ شب گھر مرے آیا عارفؔ
مجھ کو تو خبر ہی نہیں واللہ باللہ

اصل میں نقل بردار، غلط نویس بھی ہے اور غلط اندیش بھی، رباعی کے اوزان متعین ہوتے ہیں اور اس رباعی کا وزن لاحول ولاقوۃ الا باللہ ہے، رباعی کے عنوان سے اس میں چار قطعے آئے ہیں۔ یہاں خلطِ مبحث ہوگیا ہے، ایک قطعہ نواب ضیاء الدین احمد خاں کی مدح میں ہے اور فارسی زبان میں ہے اور ایسے مختلف طویل اور مختصر قطعات ہیں جن کی زبان فارسی ہے، ایک قطعہ نواب امین الدین احمد خاں کی تعریف میں ہے جن کو برادر لکھا ہے، اس قطعے کے اشعار کی تعداد آٹھ ہے۔

قصائد

پہلے قصیدے میں دوہری جدول ہے، پہلی دوخطی جدول میں 'رب یسّر، بسم اللہ الرحمٰنِ الرحیم، وتمّیم بالخیر' تحریر کیا گیا ہے۔ دوسری جدول میں یہ عبارت لکھی ہے: قصیدہ در نعت جناب سیّد سرورِ کائنات مظہرِ مفتخرِ موجودات مالکِ کون و مکان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ اس عنوان سے پتا چلتا ہے کہ حضرت رسول مقبول کی ذاتِ والا صفات کے لیے معنی کے کون و مکان کا خطابی کلمہ بھی صاحبِ تحریر کے یہاں مناسب و موزوں ہے اور اس سے خود عارف یا اس نسخے کے نقل بردار (کاتب) کے اپنے عقائد کا پتا چلتا ہے، یہ قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

قصیدہ (۱)

بیاں میں کیا کروں شانِ محمدؐ
خدا جب ہو ثنا خوانِ محمدؐ

ردیف میں خود حضور کا اسم مقدس موجود ہے اور شعر کے اندازِ ادا سے پتا چلتا ہے کہ یہ میلادوں میں پڑھے جانے والے اشعار کے اسلوب پر لکھا گیا ہے۔

لب ولہجہ نرم وشیریں ہے اور اندازِ گفتگو میں ایک طرح کا والہانہ پن موجود ہے۔ یہ قصیدہ انتیس شعروں پر مشتمل ہے اور اس شعر پر ختم ہوتا ہے:

خدا کے ہوگئے محبوب عارف
جو دل سے ہیں محبانِ محمدؐ

قصیدہ (۲)

اس دوسرے قصیدے کے آغاز میں کوئی جدول موجود نہیں ہے اور مطلعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ 'قدم شریف' کو پیشِ نظر رکھ کر کہا جانے والا قصیدۂ منقبت ہے، اس لیے کہ پہلے ہی شعر میں اس کا ذکر آیا ہے کہ خطۂ دہلی اپنے رُتبے کے اعتبار سے عرش سے کچھ کم بھی نہیں کہ وہاں تیرا نقشِ قدم موجود ہے۔ اُس زمانے میں قدم شریف پر تقریبات بھی ہوتی رہتی تھیں، یہ نشانِ قدم شہزادۂ فتح خاں کی قبر پر نصب ہے کسی دوسرے مقام سے حضرت مقدوم جہانیہ جہاں گشت لے کر آئے تھے، یہ فیروز تغلق کے عہد کا واقعہ ہے۔ مطلعے کا شعر یہ ہے:

رُتبہ میں خِطۂ دہلی نہیں کچھ عرش سے کم
یعنی موجود ہے اس جاے ترا نقشِ قدم

اس کے بعد کے جدول میں مطلعِ ثانی لکھا گیا ہے اور اس کے ذیل میں یہ شعر آیا ہے:

اُس کا عالم نہیں جز خالقِ ہر دو عالم
جو تری صورتِ معنی میں ہے اقدس مُدغم

اس کے بعد کے جدول میں قطعہ تحریر ہے، اس کے ذیل میں یہ شعر آیا ہے:

حق تعالیٰ سے کیا منشئ تقدیر نے عرض
.... حسرت و افسوس سے دم

اس کے بعد کے جدول میں ایک اور قطعہ بطورِ عنوان لکھا ہوا ہے، اس کے ذیل میں یہ شعر تحریر ہے:

نہ تو مفلس کوئی ہے اور نہ کوئی ہے مغلوب
عام ہے بسکہ زمانے میں تیرا عدل و کرم

یہ قصیدہ ساٹھ شعروں پر مشتمل ہے جس میں یہ دونوں قطعات بھی شامل ہیں اور مطلع ثانی بھی، اس قصیدے کا آخری شعر یہ ہے جس میں عارف کا تخلص نہیں ہے:

دولتِ قرب سے اپنی مجھے شیاً للہ
یا نبی اَنتَ و اُمّی شہِ بطحا و حرم

قصیدہ (۳)

اس قصیدے کے جدول میں یہ عبارت آئی ہے: "قصیدہ در منقبت حضرت عمر رضی اللہ (تعالیٰ) عنہ"۔

یہ بہت اہم قصیدہ ہے ان معنوں میں کہ عام تاثر یہ ہے کہ غالب اثنا عشری تھے۔ یہاں تک کہ اپنے قطعوں کے آخر میں دائرہ بنا کر اس پر بارہ لکھ دیا کرتے تھے اور خطوں میں اس کی وضاحت بھی کی یہ بات دوسری ہے کہ جب ان پر اثنا عشری ہونے کا الزام لگایا گیا تو انھوں نے اپنی صفائی میں ایک رباعی میں کہی تھی:

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے رافضی و اثنا عشری (الخ)

عام تاثر یہ ہے کہ عارف بھی شیعہ مسلک کے تھے لیکن خلیفۂ دوم کی منقبت میں یہ قصیدہ ان کے مسلک پر روشنی ڈالتا ہے۔

یہ بات اس لیے زیادہ اہم ہے کہ عام طور سے قصائد منقبت حضرت علی اور اصحابِ ائمہ کے لیے تو لکھے جاتے ہیں لیکن اصحابِ ثلاثہ یعنی حضرت ابوبکر، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمانی کے لیے نہیں۔ اثنا عشری عقیدہ رکھنے والے سے تو یہ توقع ہو بھی نہیں سکتی کہ وہ

قصیدہ (۳): یہ بہت اہم قصیدہ ہے ان معنوں میں کہ عام تاثر یہ ہے کہ غالب اثنا عشری تھے۔ یہاں تک کہ اپنے قطعوں کے آخر میں دائرہ بنا کر اس پر بارہ لکھ دیا کرتے تھے۔ اور خطوں میں اس کی وضاحت بھی کی، یہ بات دوسری ہے کہ جب ان پر اثنا عشری ہونے کا الزام لگایا گیا تو انھوں نے اپنی صفائی میں ایک رباعی بھی کہی تھی:

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری   کہتے ہیں مجھے رافضی و اثنا عشری

عام تاثر یہ ہے کہ عارفؔ بھی شیعہ مسلک کے تھے۔ لیکن خلیفہ دوم کی منقبت میں یہ قصیدہ ان کے مسلک پر روشنی ڈالتا ہے۔

ان تینوں اصحاب کے لیے کچھ لکھے گا، خود اہلِ سنت والجماعت بھی اس موضوع پر قلم نہیں اٹھاتے، بہر حال اس قصیدے کا پہلا شعر یہ ہے:

ایزدِ جان آفریں کو کر کے کہتا ہوں گواہ
گر نہ تیرا عشق ہو مجھ کو تو میرا روسیاہ

اس کے بعد کے نمایاں جدول میں قطعہ کا عنوان موجود ہے:

سیرِ مُہ افلاک کا کرتا ہے جس دم عزم تو
واہ کیا شوکت ہے تیری مُرزبانِ ملک و جاہ

اس کے ذیل میں یہ شعر۔ چودہ شعروں کے اس قطعے کے بعد مطلعٔ ثانی ہے:

عرش منزل جو کہے تجھ کو نہ سمجھا تجھ کو آہ
روضہ خیر البشر میں جب ہو تیری خواب گاہ

یہ قصیدہ پچاس شعروں پر مشتمل ہے جس میں قطع اور مطلع دونوں موجود ہیں۔ آخری شعر یہ ہے:

جس قدر آباد ہوویں دہر میں ترے محب
اُتنے ہی دشمن تیرے دنیا میں ہوں خوار و تباہ

اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قصیدے کو دشمنوں کے حق میں بددعا کرتے ہوئے ختم کیا گیا ہے۔

قصیدہ (۴)

اس قصیدے کا جدول اس عبارت سے مزیّن ہے: ''قصیدہ در منقبت حضرت سیّد الشہدا امام حسن علیہ السلام''۔ مطلعے کا شعر یہ ہے:

کس لیے جاتی ہے تو سوئے گلستان اے صبا
جا تجھے بھیجوں جہاں، میں تیرے قرباں اے صبا

یہ قصیدہ ستاسی شعروں پر مبنی ہے۔ قصیدے کا آخری شعر/مقطع یہ ہے:

سُرمہ کی جا خاک وحاں کی چشم عارف میں لگا
کچھ نہیں اس کے سوا کچھ اس کا درماں اے صبا

سلام (۱)

اس کے جدول میں سلام در منقبت درج ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے:

رتبہ جو ہے مجرائی آلِ عبا کے واسطے
فخر کرتے گر یہ ہوتا انبیا کے واسطے

یہ سلام ستاون شعروں پر مشتمل ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے جس میں عارف نے اپنا تخلص شامل کیا ہے:

رات دن، کھاتا ہوں میں، عارف غمِ آلِ نبی
دل مگر معدہ بنا ہے اس غذا کے واسطے

قصیدہ (۵)

اس کے بعد کے جدول میں یہ عبارت مرقوم ہے: ''قصیدہ در منقبت خواجہ فخر الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ''۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

ہوئی ہر انجمنِ عرش قطبِ ربانی
یہ بست و ہفتم ماہِ جمادی الثانی

اس کے بعد کے جدول میں مطلع ثانی درج ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے:

رکھے جو آن کے اُس آستاں پہ پیشانی
تو بھول جائے مہ و مہر کی درخشانی

یہ قصیدہ بیاسی شعروں پر مشتمل ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے:

مخالفوں کا تیرے دن ہو تیرہ تر، شب سے
موافقوں کی ہو شب مثلِ صبحِ نورانی

قصیدہ (۶)

اس کے جدول میں یہ عبارت تحریر ہے: ''قصیدہ در منقبت جناب مولانا فخر الدین رحمۃ اللہ علیہ''۔ اس کے ذیل میں یہ شعر آیا ہے:

سخن نہ کیوں کہ ہمارا ہو رشکِ دُرِّ یتیم
ثنائے فخرِ جہاں کر رہے ہیں ہم ترقیم

اس کے بعد کے جدول میں قطعہ تحریر کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

شہا کہے کبھی جو بہ تقدیرِ افضلِ امت
کرے جو زیبِ بدن سر بسر لباسِ کلیم

اس کے بعد کے جدول میں مطلعِ ثانی تحریر ہے اور اس سے پہلے یہ شعر آیا ہے:

یہ جی میں ہے کہ لکھوں ایک مطلعِ رُوشن
فروغ پائے نہ جس پر فروغِ دستِ کلیم

مطلعِ ثانی کا پہلا شعر یہ ہے:

ہوئے ہیں جو تجھے حاصل مدارجِ تسلیم
کسی کو وہ نہیں معلوم بجز خدائے علیم

یہ قصیدہ ستر شعروں پر مشتمل ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے جو حضرت فخر جہاں کے لیے ہے:

رہے جہاں میں سدا آستانِ فخرالدّین
زیادہ کعبۂ اقدس ہے واجب التعظیم

قصیدہ (۷)

اس کے جدول میں یہ عبارت درج ہے: ''قصیدہ در مدح حضرت مولانا فخرالدین رحمۃ اللہ علیہ''۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

بیان کس سے ہو مقدورِ فخر دین (کذا)
ہوتا ہے وہی جو کہ ہو منظورِ فخرِ دین

یہ بھی جیسا کہ ردیف سے ظاہر ہے، مولانا فخرالدین کے لیے کہا گیا قصیدہ ہے۔ ہم نے اس پر بہت کم توجہ دی ہے کہ بزرگانِ دین کے لیے جو قصائد لکھے گئے ہیں ان کی تخلیقی فضا اور شعری خوبیاں کیا ہیں۔ مولانا فخرالدین اپنے وقت کے بڑے بزرگ اور پاک باطن شخص خیال کیے جاتے تھے۔ احاطہ کالے صاحب مولانا فخرالدین ہی کے بیٹے میاں کالے صاحب کا اپنا دائرہ تھا، جو اب محلّہ بن گیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر بھی ان کے خاندان میں مرید تھے اور شہر کے بہت لوگ تھے جو مولانا فخرالدین اور ان کے خاندان سے عقیدت رکھتے تھے۔ جہاں تک اس قصیدہ یا مدح کا سوال ہے یہ موجودہ صورت میں ایک ترجیع بند ہے، اس قصیدے

قصیدہ (۷): اس قصیدے کی ردیف میں فخرالدین کی 'دال' تشدید سے نہیں پڑھی جا سکتی اس لیے غیر مشدّد پڑھنا پڑے گا یا ردیف فخر دین پڑھی جائے گی۔ وزن ہے: مضارع کا آہنگ۔ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلان / فاعلن۔

قصیدہ (۸): ۱؎ غزل کے مطلعے میں سہوِ کتابت ہے، عزرائیل کی جگہ جبرئیل لکھا ہے۔

میں کل نو بند ہیں۔ پہلے بند میں آٹھ شعر آئے ہیں، باقی دوسرے بند دس دس شعروں پر مشتمل ہیں۔ترجیع کا شعر فارسی کا مشہور شعر ہے:

آنا کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا، بود کہ گوشۂ چشمِ بما کنند

وہ مقدس شخصیتیں جو ایک نگاہ میں خاک کو کیمیا بنا دیتی ہیں، شاید ان کی توجہ ہمارے حال پر بھی ہو جائے اور وہ ہمارے لیے ایک گوشۂ چشم یعنی مہربانی کی صورت پیدا کر دیں۔ اس قصیدے میں اشعار کی کل تعداد اٹھاسی ہے۔

قصیدہ (۸)

اس کے جدول میں یہ عبارت درج ہے: ''قصیدہ در مدح مرزا ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ، بادشاہِ غازی، خلداللہ مُلکہٗ وسلطنتہٗ ''۔اس قصیدے کا پہلا شعر یہ ہے:

میرے کاشانۂ ظلمت کی یہ سمجھو تمثیل
کہ یہ گویا ہے سویدائے دل تنگِ بخیل

اس کے بعد کے جدول میں غزل تحریر ہوئی ہے مگر یہ غزل خود اس قصیدے کا ہی حصہ ہے اور اسی کی زمینِ شعر میں ہے،اس کا مطلع یہ ہے:

آپ ہی کیوں نہ نکالوں کوئی مرنے کی سبیل
کیا ہوا مجھ کو اگر بھول گیا عزرائیل[1]

لیکن یہ غزل، غزل کے طور پر نہیں، غزلیہ اشعار ہیں جو قصیدے کے جزو کے طور پر آئے ہیں اسی لیے غالباً یہ طویل بھی ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں طویل غزلوں کے لکھے جانے کا عام رواج تھا۔آخری شعر/مقطع یہ ہے:

دل میں ہے نعت میں وہ مطلعِ رنگیں لکھیے
رشک سے جن کے اُڑے رنگِ گلستانِ خلیل[1]

یہاں مطلعِ رنگیں کے بجائے مطلعِ روشن ہوتا تو نعت کی مناسبت سے زیادہ خوبصورت بات ہوتی۔گلستانِ خلیل کا رنگ اڑنا بھی ایک گونا سوئے ادب ہے اس لیے کہ قرآن میں مسلمانوں

---

[1] اس مقطعے سے ذہن کو دھچکا لگا کیوں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بارے میں ایسی جرأت نہ صرف دریدہ ذہنی ہے بلکہ بنیادی اسلامی عقیدے کے خلاف ہے اس لیے کہ کوئی نماز درود ابراہیمی کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

کو ایک ایسی امت کہا گیا ہے جن کے باپ ابراہیم تھے اور حضرت ابراہیم ہی کو خلیل اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ غزل اکتیس شعروں پر مشتمل ہے، اس کے بعد کے جدول میں مطلعِ ثانی تحریر ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے:

جب سے آغاز ہوئی وحی کی تجھ پر تنزیل
زینت طاق ہیں توریت و زبور و انجیل[1]

اس کے بعد کے جدول میں مطلعِ ثالث آیا ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے:

کون ماہی کے مراتب ہوئے عالم میں عدیل
ہے وہ حوت کہ ہو مہر کی جس میں تحویل

'ماہی مراتب' مغل دربار کی ایک اصطلاح ہے اور لشکر کے ساتھ جو نشاناتِ امتیاز چلتے تھے وہ ماہی مراتب کہلاتے تھے اس طرح کے نشانات جلسوں کے ساتھ اب بھی شامل رہتے ہیں۔ حوت عربی میں مچھلی ہی کو کہتے ہیں، آسمان کے بارہ بُرجوں میں ایک بُرج میزان ہے، ایک اسد ہے، ایک حوت ہے اور تحویل کا لفظ بھی آیا ہے جو کسی برج میں ستارے کے رہنے سے عبارت ہے اور جن کی ایک زمانی مدت مقرر ہوتی ہے۔ یہاں مہر کا لفظ بھی موجود ہے جو سورج کے لیے ہے۔ ایک وقت وہ بھی ہوتا ہے جب سورج تحویل کے اعتبار سے بُرجِ حوت میں ہوتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں علمِ نجوم کے اسی مسئلے کی طرف اشارہ ہے، اس شعر پر یہ قصیدۂ عزّا ختم ہوتا ہے:

خیر اندیش ترا جو ہو وہ عالم میں عزیز
جو ہو (بد) خواہ ترا وہ رہے دنیا میں ذلیل[2]

یہ قصیدہ سو شعروں پر مشتمل ہے۔

قصیدہ (۹)

اس کے جدول میں یہ عبارت تحریر ہے: ''قصیدہ در مدح بادشاہ جم جاہ بہادر شاہ ظفر''۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے:

---

[1] یہ بھی نازیبا بات ہے اور اسلامی عقیدے کے خلاف ہے کیوں کہ قرآن پاک میں جابجا توریت و انجیل کے حوالے ہیں۔

[2] دوسرے مصرعے میں ایک لفظ بریکٹ میں بڑھایا گیا ہے۔

نہ کیوں کہ ہو تری ابرو میں تابدار گرہ
یہ تیغ رکھتی ہے مانندِ ذوالفقار گرہ

اس کے بعد کے جدول میں مطلعِ ثانی لکھا ہوا ہے، اس کا مطلعے کا شعر یہ ہے:

شہا وہ تیرے میں، تیرے ہیں سو ہزار گرہ
زمیں سے تا فلک اس کی ہیں دو (تین) چار گرہ[1]

اس قصیدے کا آخری شعر یہ ہے:

کیا ہے میں نے شہا جب کہ عرض مقصد دل
اخیر شعر نہ کیوں آئے بار بار گرہ

یہ قصیدہ چوہتر شعروں پر مشتمل ہے۔

قصیدہ (۱۰)

اس کے جدول میں صرف قصیدہ تحریر ہے، اس کے ساتھ کوئی وضاحتی عبارت نہیں ہے، اس کا مطلع یہ ہے:

زہے نصیب کہ ہم ترے در پہ آ پہنچے
ہمارے رُتبۂ عالی کو چرخ کیا پہنچے

یہ شہزادہ فتح الملک عرف مرزا فخرو کے لیے ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے:

وہ جب ہو انجمنِ شاہزادہ فتح المُلک
محال ہے کہ بہ ایں فرد لافتح پہنچے (کذا)

اس کے بعد کے جدول میں مطلعِ ثانی تحریر ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے:

وہ آستاں نہ کسی کی جہاں دعا پہنچے
سرِ نیاز میرا، وہاں عجب ہے جا پہنچے

اس قصیدے میں پچپن شعر آئے ہیں۔

قصیدہ (۱۱)

اس قصیدے کے جدول میں یہ عبارت تحریر ہے: ”قصیدہ در مدح نواب ضیاء الدین احمد خاں“۔ اس کا مطلعے کا شعر یہ ہے:

---

[1] دوسرے مصرعے میں ایک لفظ بریکٹ میں بڑھایا گیا ہے۔

آج وہ رات ہے اے سرورِ عالی فطرت
زلفِ شاہد سے سوا جس کی ہے دلکش ظلمت

اس قصیدے میں اشعار کی کل تعداد باون ہے، اس کا آخری شعر یہ ہے:

دوستوں کو تیرے (عالم) میں ہو وہ جاہ نصیب
جن (کے) قدموں میں پڑ(ی) رہوے ہمیشہ رفعت[1]

قصیدہ (۱۲)

اس کے جدول میں قصیدہ تحریر ہے لیکن یہ قصیدہ کس کے متعلق ہے اس کی کوئی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ مطلعے کا شعر یہ ہے:

پیدا ہوا جہان میں وہ فخرِ روزگار
قدموں سے جس کے لگی (ساتھ) آئی ہے بہار[2]

کیوں کہ اس میں فخرِ روزگار کا لفظ آیا ہے اس لیے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ یہ بھی حضرت شہزادہ مرزا فخر الدین (عرف مرزا فخرو) کے لیے ہے جس کا اظہار تمہید کے ذیل میں لکھے گئے بعض دوسرے شعروں سے ہوتا ہے۔ اس میں کوئی مطلعِ ثانی نہیں آیا۔ یہ قصیدہ پچپن شعروں پر مشتمل ہے۔ اس کا آخری شعر یہ ہے:

اعدا کو تیرے وادیِ غربت رہے نصیب
ہوں جب تلک کہ خارِ مغیلاں میں آشکار[3]

قصیدہ (۱۳)

اس کے جدول میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: ''قصیدہ در مدح نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ تخلص''۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، غالبؔ اور ظفرؔ کے عہد سے تعلق رکھتے تھے، فارسی میں بھی ان کا کلام موجود ہے۔ اردو کلام میں مومنؔ سے اصلاح لیتے تھے بعد میں غالبؔ سے بھی

۱۔ اس شعر میں دو لفظ چھوٹ گئے جو یہاں بریکٹ میں لکھ دیے گئے ہیں۔
۲۔ اس مطلعے میں قیاسی تصحیح کی گئی ہے کہ نگارشِ متن کے دوران ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناواقفیت کے سبب کاتبِ نسخہ سے ایک سے زیادہ سہو ہو گئے تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس کاتب نے اس نسخے کو لکھا ہے وہ خود کم سواد ہے اور متن کو صحیح پڑھنے میں مختلف مواقع پر تا کام رہا ہے۔
۳۔ مغیلاں کیکر کے درختوں کو کہتے ہیں۔

مشورہ کرنے لگے۔ شیفتہ 'تذکرۂ گلشنِ بے خار' کے مولف بھی ہیں۔ اور اس وقت کے بہت معزز اور محترم اہلِ دہلی میں سے تھے۔ یہ مومن کے شاگردوں میں سے ہیں اور حالی ان کے ساتھ ان کی جاگیر میں (جہانگیر آباد) رہے تھے۔ یہ علی گڑھ اور دہلی کے راستے میں واقع تھی۔

شیفتہ صاحبِ دیوان ہیں اگرچہ ان کی شاعری کی شہرت نہیں ہوئی لیکن مومن اور غالب کے حوالے سے ان کا ذکر اکثر آتا ہے۔ اس قصیدے کا پہلا شعر یہ ہے:

کیوں نہ ہو شیفتہ کی مدح میں، گر
آبروئے سخن ہے، مدِ نظر

درمیان میں ایک شعر ملتے جلتے خط کے ساتھ کسی نے بڑھایا ہے، وہ شعر یہ ہے:

نسخہ، جو صرف متن دیکھا ہے
عرض کرتا ہوں اے کرم گستر

اور ایک مصرع اس صفحے کے پہلے اور دوسرے شعر کے درمیان تحریر ہوا ہے، وہ قلم زد کر دیا گیا، اس کے بعد کے جدول میں غزل تحریر ہے، اس کا پہلا شعر یہ ہے:

نالہ و آہ میں ہو خاک اثر
اس میں شعلہ رہا نہ اُس میں شرر

غزل کے مقطعے کا شعر یہ ہے:

ذلتِ عشق مفت ہے عارف
ہاتھ عزت کے بدلے، آئے اگر

اس کے بعد قصیدے کے اشعار کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کل اشعار کی تعداد اکیانوے ہے۔ آخری شعر یہ ہے:

ترے رد و قبول سے لیکن بیم و امید ہیں خجستہ سیر

قصیدہ (۱۴)

اس کے جدول میں قصیدے کا لفظ تحریر ہے اور آنے والے قصیدے کا پہلا شعر یہ ہے:

جو کچھ رکھا ہے، پردۂ کتمان میں مستتر
ظاہر کرے ہے پر تیری نظر

اس میں کوئی مطلعِ ثانی نہیں ہے اور قصیدے کا آخری شعر یہ ہے:

اے پردہ دارِ عیبِ نکوہیدہ خصلتاں
تجھ پر ہمیشہ ہو کرم سیّد البشر

اس قصیدے میں کل چوالیس اشعار ہیں۔

سلام (۱)

ان قصائد کے بعد چار سلام آئے ہیں۔ جدول میں 'سلام' کا عنوان آیا ہے اور پہلا شعر یہ ہے:

مُجرائی شاہ کی امت پہ ہیں احساں کتنے
لکھے تو صرفِ قلم ہوویں نیستاں[1] کتنے

اس سلام میں اکتیس شعر ہیں جو سلام کی عام روایت سے قدرے مختلف ہیں، لیکن اس زمانے میں غزلیں بہت طول طویل لکھی جاتی تھیں، اس کا اثر سلام پر بھی مرتب ہوا۔ اس میں آنے والے شعروں کی کل تعداد اکتیس ہے۔ آخری شعر یہ ہے:

نامِ شبیر پہ ہوتا ہوں میں قرباں عارفؔ
مجھ پہ تو دیکھ کہ اب ہوتے ہیں قرباں کتنے

سلام (۲)

اس کے جدول میں بھی سلام کا عنوان آیا ہے اور پہلا شعر یہ ہے:

مجرائی جو رن میں شاہِ بحر و بر کے پاس ہے
سود و نفعِ دو جہاں اس کے ضرر کے پاس ہے

اس سلام میں تیئیس شعر آئے ہیں اور آخری شعر یہ ہے:

کیوں نہ پھر اندھیر ہو ماتم سرائے دہر میں
شامِ غم عارفؔ لکھی یاں ہر سحر کے پاس ہے

---

[1] 'نیستان' بانس کے جنگل کو کہتے ہیں نئے بانسری کو کہا جاتا ہے اور چھوٹے بانس کے ٹکڑوں سے قلم بنائے جاتے تھے اسی لیے یہاں نیستان تحریر کے تعلق سے آیا ہے۔

سلام (۳)

اس جدول میں بھی یہی صورت ہے اور عنوانِ سلام درج ہے، پہلا شعر یہ ہے:

مجرئی کس سے بیان ہو جاہ و شانِ اہلِ بیت
عرش کہیے جس کو ہے وہ آستانِ اہلِ بیت

اس میں پچیس شعر آئے ہیں اور آخری شعر یہ ہے:

ہم زباں عارفؔ میرا کیوں کر نہ ہو روح الامین
ایک وہ ہے ایک میں ہوں مدح خوانِ اہلِ بیت

سلام (۴)

اس کے جدول میں بھی 'سلام' تحریر ہے اور پہلا شعر یہ ہے:

سلام قبلۂ حاجاتِ دو جہاں پر ہے
جہاں کو سجدہ روا جس کے آستاں پر ہے

اس میں کل چودہ شعر آئے ہیں اور آخری شعر یہ ہے:

فرشتے غم میں سبھی ... میری طرح عارفؔ
اُنھیں اُڑانے کو کیا خاک آسماں پر ہے

مخمس

ان سلاموں کے بعد جدول میں مخمس بطورِ عنوان لکھا ہوا ہے اور اس کے نیچے قدسی مشہدی کے معروف نعتیہ اشعار کو مخمس میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلا بند یہ ہے جس سے اس مخمس کے اندازِ بیان اور طرزِ فکر کا اسلوب معلوم کیا جا سکتا ہے:

تیری ہمت کے برابر تری عالی نسبی تو ہے آبِ گہر ہاشمی و مُطّلَبی
جب کہ ایسا ہو خدا چاہے کہ انساں (ہو) نبی مرحبا سیدِ مکّی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت کہ عجب خوش لقبی[1]

چوتھا اور پانچواں مصرع قدسی مشہدی کا ہے جس کو بطورِ تضمین اور ترکیب بند استعمال کیا گیا ہے۔ یہ کل نو بند ہیں جو ترکیب بند کی شکل میں ہیں۔ آخری بند کے دو مصرعے چوتھا اور پانچواں قدسی کے اس شعر پر مشتمل ہیں:

---

[1] متن میں "خدا چاہے انساں ہی نبی" لکھا ہے۔

سیّدی انتَ حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

اس کے بعد کے جدول میں تمام شد لکھا ہے اور بعد ازاں سلام لکھا گیا ہے اور تمام شعر اپنے پہلے اور دوسرے مصرعے میں اسلام سے شروع ہوئے ہیں یہ بھی نعت سے متعلق ہے، دوسرا شعر اس طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے:

اَلسلام اے مقتدائے مُرسلین
اَلسلام اے رحمۃ للعالمین

اس سلام میں کل انتالیس شعر ہیں مگر آخر کے نو شعر السلام کے التزام کے ساتھ نہیں ہیں۔ آخری شعر یہ ہے:

کُن رہا مارا تو از اندوہ رنج
رحم کُن برما بہ حقِّ ہفت و پنج

سات اور پانچ مل کر بارہ ہوتے ہیں اور یہاں اس سے بارہ امام مراد ہیں۔

عارفؔ کے کلام کا غیر معمولی حجم یا ضخامت بھی ذہن میں ایک سوالیہ نشان پیدا کرتی ہے کہ جس آدمی کی عمر کم ہوئی اس کا آخری دور بیماریوں میں بھی گزرا۔ اس نے شعر گوئی کے لیے کتنی فرصت نکالی اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کچھ اور کرتے ہی نہیں تھے صرف شعر کہتے تھے۔

عارفؔ کے زمانے میں زبان میں نئے تجربے بھی ہو رہے تھے، وہ ہر سطح پر کامیاب تھے یا نہیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے، عارفؔ نے اپنی غزلیہ شاعری میں اس کا کوئی اثر قبول نہیں کیا، اس لیے کہ ان کے اس ضخیم دیوان میں اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔

وہ عامیانہ انداز سے غزل کہتے ہیں جس میں زبان اور محاورے کا کوئی خیال رکھا جاتا ہو یہ تو بالکل ممکن ہے لیکن زبان و فقرات کی در و بست کا خیال نہیں رکھا جاتا، یہ ادبی رویّہ یا شاعرانہ روش عارفؔ کے کلام میں شروع سے آخر تک دیکھنے کو ملتی ہے۔

لیکن قابلِ توجہ ایک امر یہ ہے کہ ان کے قصائد میں علمیت اور ادبیت کا جو معیار اور مزاج ملتا ہے وہ ان کی غزلوں میں نہیں ملتا۔ ایک شاعر کے یہاں شعری اصناف میں الگ رنگ ضرور ہو سکتا ہے، مگر ادبی مزاج الگ نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں عارفؔ کی شاعری کا اور ان کے شعری مزاج نیز اس اختلاف کے بارے میں تحقیقی تجزیہ ضروری ہو جاتا ہے، یعنی

عارفؔ کی شاعری، غزل نگاری اور قصیدہ گوئی میں جو فرق و امتیاز اس سطح پر نمودار ہوا ہے اس کے پیچھے کیا حقائق موجود ہیں۔

اہلِ بیت سے محبت مسلم معاشرے میں ایک عام رویہ رہا ہے، اس میں تصوف کو بھی دخل ہے اور مذہب کو بھی، لیکن عام طور پر غیر شیعی عقائد رکھنے والے اساتذہ کے یہاں ائمہ اہلِ بیت کی تعریف میں حضرت علیؓ کے لیے تو قصیدے مل جاتے ہیں، مرثیے میں حضرت امام حسن اور حسین کے لیے بھی عقیدت مندیوں کا اظہار سامنے آتا ہے، لیکن دوسرے اماموں کے لیے قصیدوں کی مثالیں بہت کم ہیں۔ غالبؔ کے یہاں فارسی میں ضرور مل جاتی ہیں لیکن اردو میں تو ایسی مثالیں تلاش کرنا مشکل ہے۔

عارفؔ کی اس طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کس پس منظر کے باعث ہے اور اس سے وابستہ سچائیاں کیا ہیں؟ ان پر موجودہ معلومات کی روشنی میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ عارفؔ کی شاعری اور خاص طور پر ان کی قصیدہ نگاری کے متعلق کسی نے بھی کچھ نہیں لکھا، یہاں تک کہ ان کے خاندان سے وابستہ افراد نے بھی اس کا اظہار نہیں کیا جب کہ اس میں بہت سے ادبی افراد موجود ہیں۔ یہ بھی ایک سوالیہ نشان ہے؟

مخطوطے کا تعارف اور مشتملات

عارفؔ کی شاعری کے متعلق اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ان کا کلیات دو دیوانوں پر مشتمل ہے، دوسرے دیوان کا نام 'مطلعِ مہرِ سعادت' رکھا گیا تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حمیدہ سلطان صاحبہ نے لکھا ہے: ''دوسرا دیوان 'مطلعِ مہرِ سعادت' مرتب کیا اور اپنے ذہن رسا سے حضرت غالب جیسے شہبازِ سخن کو فتح کرلیا''۔

ان میں آخری جملے انشا پردازانہ ہیں جن کا تنقیدی سلامت روی سے کوئی واسطہ نہیں، اس لیے کہ یہ دونوں دیوان جو دستیاب ہیں اور ہزاروں اشعار پر مشتمل ہیں ان میں کہیں بھی اس غیر معمولی ذہانت کا غزلوں میں پتا نہیں چلتا جس کے لیے یہ کہا جاسکے کہ غالبؔ جیسے شہبازِ سخن کو فتح کرلیا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ یہ جملہ اپنے معنی کی ترسیل سے اس اعتبار سے محروم ہے کہ شہباز کے ساتھ فتح کرنے کا لفظ نہیں آتا مقید کرنا یا شکار کرنا ہوسکتا تھا۔ بہر حال غالبؔ، عارفؔ سے محبت کرتے ہوں اور جیسا کہ لکھا گیا ہے ان کو راحتِ روح اور شمعِ دودماں

کہتے ہوں یہ بالکل ممکن ہے مگر عارف کی ذہانت غالب پر بھی غالب آ گئی ہو کم از کم عارف کی غزلیہ شاعری کی روشنی میں اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا۔

دیوانِ عارف کے نسخے: دیوانِ عارف کے دو قلمی نسخوں کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے حمیدہ سلطان صاحبہ نے لکھا ہے:

"بنارس لائبریری میں میں نے دو مکمل نسخے دیوانِ عارف کے دیکھے، ان میں سے ایک وہ ہے جس کو نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں نے ترتیب دیا تھا اور اس کی ہی نقل نواب سعید احمد خاں نے کرائی تھی یہ ہر طرح مکمل دیوان ہے"۔

راقمہ نے اس بارے میں ڈاکٹر حنیف نقوی سے معلومات کیں تو انھوں نے جواب دیا کہ جو نسخہ رام پور میں ہے وہی نسخہ نقل یا زیروکس کی شکل میں بنارس لائبریری میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے نسخے کی موجودگی سے موصوف نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے نواب طالب کے منتخب نسخے کی ترتیب اور اس پر ان کے مقدمے کا ذکر کیا ہے جسے وہ چھپوانا چاہتی تھیں، مگر وہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں تلف ہو گیا۔ انھوں نے رام پور کے قلمی نسخے کا ذکر کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا ہے:

"اب ایک مکمل دیوانِ عارف لوہارو سیکشن لائبریری رام پور میں ہے، یہ دیوان مرزا حیدر حسن خاں عارف کے چھوٹے بھائی کی ملکیت رہا ہے، اس کی ہی نقل کرا کے تصحیح ہونے کے بعد دیوانِ عارف چھپوانے کا ارادہ ہے"۔

یہی وہ قلمی نسخہ ہے جس کی زیروکس کاپی راقمہ نے اپنے اس انتخاب کے لیے حاصل کی ہے۔ یہ حیدر حسن صاحب کی ملکیت رہا ہے یہ ایک اہم بات ہے لیکن اس پر ان کی کوئی مہر یا تحریر نہیں ہے۔

حمیدہ سلطان صاحبہ نے ایک اور نسخے کا ذکر کیا ہے جو عارف کے تمام کلام پر تو مشتمل نہیں ہے لیکن قلمی نسخے کے ذکر ہونے کی حیثیت سے بے حد اہم ہے، موصوفہ کی فراہم کردہ اطلاع یہ ہے:

"حیدر آباد سر سالار جنگ میوزیم میں جو کلیات عارف ہے اس میں بھی

ایک تہائی کلام نہیں ہے، اس کا عکس کرا کے میں نے ایوانِ غالب کی
لائبریری میں محفوظ کر دیا ہے"۔

راقمہ کو اپنے اس تدوین کے لیے انجام دہی کے سلسلے میں غالب انسٹی ٹیوٹ میں یہ دیوان نہیں ملا۔ حیدر آباد کا نسخہ بھی راقمہ نے نہیں دیکھا۔ راقمہ نے وہاں سے زیروکس منگانے کی اپنی حد تک سعی کی لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔

مخطوطے کا تعارف

زین العابدین خاں عارفؔ کے اس موجودہ نسخے میں جو راقمہ کے سامنے ہے، کل صفحات کی تعداد سات سو بہتر (772) ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ نسخہ تین سو چھیاسی (386) اوراق پر مشتمل ہے، اس میں جو حاشیے چھوڑے گئے ہیں وہ تقریباً آدھا انچ نیچے، اوپر ہیں اور اس سے کچھ زیادہ دائیں بائیں ہیں۔ ہر صفحے کا مِسطر پندرہ سطری ہے جہاں غزل ہوتی ہے وہاں ہر دو مصرعے یکے بعد دیگرے اوپر نیچے لکھے گئے ہیں باقی اشعار کا اندراج دائیں، بائیں کی تقسیم کے ساتھ عمل میں آیا ہے۔ میری دسترس میں چوں کہ زیروکس کاپی ہے اس لیے مخطوطے کی لمبائی اور چوڑائی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ حوض کی لمبائی اٹھارہ سینٹی میٹر اور چوڑائی دس سینٹی میٹر ہے۔

جہاں مقطع تحریر کیا گیا ہے وہاں جدول بنایا گیا ہے، یہ جدول دونوں مصرعوں کے گرد بھی ہے اور متن کی نگارش کے مطابق دونوں رخ پر بھی ہے جس کے ساتھ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جدول تین حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، ضرورتِ نگارش کے مطابق اس کی صورت جا بجا قدرے مختلف بھی ہوگئی ہے، شروع میں جہاں قصیدوں کا اندراج ہے وہاں قصیدے کا عنوان قائم کرنے کے لیے نسبتاً چھوٹا جدول موجود ہے مگر اس کے ساتھ کوئی داخلی تقسیم نہیں ہے۔

متن کا اندراج شروع سے آخر تک صفحات کی اپنی جدولوں کے مابین ہوا ہے، ہر جدول دو خطی ہے اور درمیان میں ایک عمودی جدول، ایک ہی شعر کے دو مصرعوں میں خاصے کے طور پر زیب قرطاس کیا گیا ہے، یہ جدول بھی جو بیشتر صورتوں میں پورے صفحے پر پھیلا ہوا ہے، دو خطی ہے۔

پہلے دیوان میں غزلیات کی کل تعداد 299 ہے، اس میں اردو کی کل غزلیں 284 ہیں اور فارسی غزلوں کی تعداد 15 ہے، مخطوطے میں غزل نمبر:

64, 65, 66, 76, 77, 93, 94, 95, 96, 97, 149, 150, 158, 159, 184

فارسی زبان میں ہیں۔ غزل 78 کی قرأت ممکن نہیں ہو سکی۔

ردیف 'الف' کے ذیل میں آنے والی غزلوں کی کل تعداد تریسٹھ (63) ہے، ردیف 'ب' میں کل تین غزلیں ہیں، ردیف 'پ' میں کل دو غزلیں آئی ہیں، ردیف 'ت' کے ذیل میں آنے والی غزلیں تعداد میں کل چار ہیں، 'ث' کی ردیف میں صرف ایک غزل ہے، ردیف 'ج' میں غزلوں کی تعداد چار پر ختم ہو جاتی ہے، ردیف 'چ' میں بھی صرف ایک غزل ہے، ردیف 'ح' میں بھی صرف ایک غزل ہے، ردیف 'خ' میں دو غزلیں ہیں، ردیف 'د' میں غزلوں کی کل تعداد پانچ ہے، ردیف 'ذ' میں دو غزلیں لکھی گئی ہیں، ردیف 'ر' میں غزلوں کی تعداد دس تک پہنچتی ہے، ردیف 'ز' کے ذیل میں آنے والی غزلیں تین ہیں، ردیف 'س' میں بھی تین غزلیں ہیں، ردیف 'ش' میں بھی تین ہی غزلیں ہیں، ردیف 'ص' میں کل چار غزلیں شامل ہیں، ردیف 'ض' میں دو غزلوں کی تحریر عمل میں آئی ہے، ردیف 'ط' میں دو اور ردیف 'ظ' میں بھی دو غزلیں شامل ہیں، ردیف 'ع' میں دو اور 'غ' میں چار غزلیں لکھی گئی ہیں، 'ف' میں تین غزلیں اور ردیف 'ق' میں دو غزلیں آئی ہیں، ردیف 'ک' میں چار اور 'گ' میں کل تین غزلوں کو شامل کیا گیا ہے، ردیف 'ل' میں دو اور 'م' کے ذیل میں چھ غزلیں تحریر ہوئی ہیں، ردیف 'ن' میں غزلوں کی تعداد تیس ہے، ردیف 'و' کے ذیل میں کل دس غزلیں ہیں، 'ہ' کی ردیف میں کل غزلوں کی تعداد تین ہے، 'ھ' کی ردیف کے ذیل میں تین غزلیں آئی ہیں، 'ی' کی ردیف میں کل بیس غزلیں ہیں اور بڑی 'ے' کی ردیف میں آنے والی غزلوں کی کل تعداد چوہتر (74) ہے جو تمام ردیفوں میں (آنے والی) سب سے بڑی تعداد ہے۔

عارفؔ کے اس دیوان میں جو دو سو اکیاسی (281) صفحات پر مشتمل ہے، شروع میں قصائد کا اندراج ہے، ان کی کل تعداد پینتیس (35) ہے، سلاموں کی تعداد چار ہے۔ مسدس کی صورت میں جو شعری تخلیقات ہیں ان کی تعداد پچیس (25) اور مخمس کی تعداد پینتیس (35) ہے، مرثیے آٹھ ہیں، قصائد، مراثی، مسدس، مخمس کی تعداد اتنی ہے کہ انھیں الگ سے ایک

مجموعے کی شکل دی جاسکتی ہے۔

کلیات کے دیوانِ دوم میں غزلوں کی کل تعداد اُنھتر (79) ہے، اس میں ردیف الف کی اٹھارہ (18) غزلیں ہیں، اس کے بعد ردیف ب، ت، ث، ج، ح، خ، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق کی کوئی غزل موجود نہیں، ردیف 'ک' کی ایک غزل، ردیف 'ل' کی پانچ غزلیں، ردیف 'م' کی ایک، ردیف 'ن' کی کُل سترہ غزلیں ہیں۔ 'ؤ اور 'ھ' کی ایک ایک غزل ہے، ردیف 'ی' کی نو اور ردیف 'ے' کی پچیس (25) غزلیں ہیں۔ غزل پینتیس (35) کی قرأت ممکن نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد قطعات ہیں، ان کی تعداد کل پچاس ہے۔ بیچ میں تین رباعیاں بھی شامل ہیں، ان کے بعد قصائد ہیں، یہ تعداد میں کل چودہ ہیں۔ سلاموں کا نشان شمار چار ہے، تو نعتیہ مخمس دیوان کے آخر میں شامل ہیں۔ دیوان کے آخر میں حضرت محمد صلعم کے اوپر ایک سلام ہے جو انتالیس (39) شعر پر مشتمل ہے۔

عارف کی اس کلیات میں غزلیں نسبتاً زیادہ ہیں اور ان کی نسبت سے قصائد، مرثیے، مسدس اور مخمس کی تعداد کم ہے پھر بھی ان اصناف سے عارف کی پُرگوئی اور قادر الکلامی کی فی الجملہ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ نسخے کے ساتھ کوئی تقریظ، ترقیمہ یا تعلیقہ نہیں ہے۔ کوئی تاریخِ تکمیل بھی نہیں ہے جس سے اس کے تدوین کے مراحل پر روشنی پڑسکے۔ دیوان اور کلیات ایک دوسرے کے معنی میں بھی استعمال کیے جاتے ہیں لیکن جب کلیات کہا جاتا ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ شاعر کا جو بھی کلام ہے وہ کسی بھی صنفِ شعر میں ہو اس میں شامل ہے تبھی تو اس پر کلیات کی اصطلاح کا اطلاق ہوتا ہے۔ دیوان کے معنی ایسے مجموعۂ کلام کے ہیں جس میں غزلیں ردیف وار جمع ہوں، لیکن ایسے مجموعہ ہائے کلام بھی دیوان کے طور پر شائع ہوتے ہیں جس میں دوسرے اصنافِ شعر کی شمولیت ہوتی ہے مگر انھیں دیوان ہی کہا گیا۔ انواع شعر دو صورتوں میں ہوسکتی ہیں موضوع کے اعتبار سے جیسے قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، شکارنامے وغیرہ جس میں رباعی اور قطعات بھی آجاتے ہیں۔ دوسرے ہیئت کے اعتبار سے، جب ہیئت موضوعِ گفتگو ہو تو اشعار کی ظاہری صورت پیش نظر رہتی ہے۔ بہ اعتبار اصنافِ شعر ان کی تقسیم سامنے نہیں ہوتی۔ ان میں مخمس، مسدس، مستزاد، مربع، مثلث وغیرہ اشکال شامل

ہوتی ہیں۔

کلیات جس صفحے سے شروع ہوتا ہے اس پر متن درج نہیں کیا گیا بلکہ صفحے کی آرائش وزیبائش کے خیال سے صرف مرقعے میں تزئین کے لیے نقوش تیار کیے گئے ہیں۔ اس طرح کے آرائشی مرقعے قلمی نسخوں میں بھی ملتے ہیں اور قدیم مطبوعہ دواوین میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس مرقعے میں جو ایک جگہ خالی چھوڑی گئی ہے وہاں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا اندراج نہیں ہے بلکہ کسی نے نیلے قلم سے ابوسعید اصلاحی اسسٹنٹ لائبریرین لکھا ہے اس کے بعد کا صفحہ بھی خالی ہے اور اُس پر بعض وہ غیرواضح نقوش ملتے ہیں جو نسخے کی نم زدگی کے باعث مذکورہ مرقعے کے کچھ منتشر اجزا ہیں۔

بعدازاں ایک شعر ہندی زبان میں ہے جس کی تحریر شکستہ نستعلیق سے قریب تر ہے۔ اس کے بعد اسی خط میں شعرِ حافظ لکھا گیا ہے اور بعدازاں یہ شعر درج ہے:

گدائے خاک نشینے تو حافظہ مخروش (حافظا)

امورِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

اس میں حافظ کا تخلص چھوٹی 'ہ' سے لکھا گیا ہے، جب کہ وہ الف کے ساتھ ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ صاحبِ نگارش کم سواد تھا اور اس کا کم سواد ہونا شعروں کی کتابت سے ظاہر ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہر شعر کے متن تک پہنچنا ایک دشوار مرحلہ ہے۔ یہ اسی شخص کی تحریر ہو جس نے بحیثیت اسسٹنٹ لائبریرین اپنا نام لکھا ہے۔

ان دونوں صفحات کا عکس پیش کیا جارہا ہے، اس کے بعد کے صفحے سے متن کلیات کی نگارش کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ پیشانی صفحہ کا سہ رخی خط کے ساتھ پیش کردہ جدول سادہ ہے، اس کے بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا گیا ہے۔ یہ ایک جدول میں ہے اور اسکے ذیلی جدول میں کوئی تحریر موجود نہیں، یہ غالباً قصیدے کے تعارف کے لیے چھوڑی گئی ہے۔ پہلا قصیدہ اس مطلعے سے شروع ہوتا ہے:

کیا دکھا کر ہم کو یہاں سے پنہاں کردیا

دستِ حسرت جو ہمارا وقفِ دنداں کردیا

اس قصیدے میں کل اکتالیس شعر ہیں، آخری شعر بطور مقطع آیا ہے جس میں عارف کا تخلص

زیروکس میں موجود نہیں لیکن اصل مخطوطے میں موجود ہے۔

مخطوطے میں جگہ جگہ درستی اور مرمت کے نقطۂ نظر سے باریک کاغذ کی چیپیاں لگائی گئی ہیں جو عکس میں بھی نظر آتی ہیں۔

'زمینِ سخن وندان کردیا' میں آٹھویں شعر کے دوسرے مصرعے میں 'نام' کا لفظ خفی قلم سے بڑھایا گیا ہے۔

عاشق بکیس کا گھر پہلے ہی ویراں کردیا

اس مصرعے پر کراس (✕) کا نشان بنایا گیا ہے اور عاشق بکیس کو عاشق غمگین سے بدلا گیا ہے۔ اور پھر اسے عاشق مسکیں لکھا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اصلاح کے طور پر دو لفظ ذہن میں آئے ہیں ظاہر ہے کہ یہ ایک غمگین اور دوسرا مسکین، ظاہر ہے کہ یہ اصلاحِ غیر ہے اور مصرعے کو آہنگ میں پڑھنے کی سعی کی گئی ہے۔ اصل عبارت میں جو بھی لفظ تھا وہ مہمل تھا اور کتابت کی واضح غلطی کے ذیل میں آتا تھا۔ آگے چل کر چودھویں شعر کا پہلا مصرعہ بیضہ عنقا بھی عدم کے زیر پر مدت سی تہا" ....

اس مصرعے میں عنقا پر ایک بڑا سا پیش بنایا گیا ہے اور ہے یا بھی کا لفظ غیر ضروری طور پر آ گیا تھا اس کو تین لکیریں کھینچ کر کاٹ دیا گیا ہے۔ "زیر پر" میں پر کے صرف دو نقطے دیے گئے ہیں۔ تھا کو تہا لکھا گیا ہے۔ ی کے نیچے دو نقطے دیے گئے ہیں جو قدیم طرزِ کتابت ہے۔ قافیے پر ہر جگہ ن کا نقطہ دیا گیا ہے جب کہ وہ نون غنہ ہے، یہ بھی قدیم طرزِ کتابت کی طرف اشارہ کرنے والی صورت ہے۔

حضرت علی کے قصیدے میں دوسری غزل بھی شامل ہے اور مطلع ثانی کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ حضورِ اکرم محمد صلعم سے متعلق قصیدہ در نعت کا یہ شعر:

مجھ کو اک نام پہ وہ کرنے تصدق ہیں ضرور

ورنہ درکار نہیں ہیں (مجھے) اصلاً گوہر

دوسرے مصرعے میں مجھے کا لفظ نہیں ہے اور اس اعتبار سے یہ اس نسخے کی غلط نگاری کا ایک نمونہ ہے۔

یائے مجہول اور یائے معروف کی نگارش میں فرق نہیں کیا گیا، اس طرح ہائے ہوز اور دو چشمی کا خلط ہے اور "ہی" لکھ کر "ہے" مراد لیا گیا ہے اور "مجھ سی" لکھ کر مجھ سے، یہ قدیم

تحریروں کی بنیادی خصوصیت کہی جا سکتی ہے اور 'آج'' کی نگارش یا قرأت میں جہاں الف پر مد آنا چاہیے وہاں ایسا کوئی نشان نہیں دیا گیا، مثلاً آنکھوں سے (انکھونسی) ہائے دوچشمی کو ہائے کہنی دار سے لکھا گیا اور الف پر مد کا نشان نہیں ہے۔

اس دورِ تحریر میں بعض آزادیاں صاحبِ قلم اپنے لیے جائز سمجھ لیتا تھا۔ یہاں ہم جن تبدیلیوں کو دیکھتے ہیں وہ انہیں جوازات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ طے کروں کو ''طی کروں'' کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ ''مجھے بھی'' میں دوچشمی ہے (ھ) کی جگہ ہائے کہنی دار استعمال ہوئی ہے، نون غنہ کے ساتھ بھی اس حالت میں نقطہ موجود ہے جب وہ مکمل صورت میں لکھا ہوا ہے، جیسے 'کرون'، 'یا' کو 'با' کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ عشق میں لفظ 'عشق' اور 'میں' کو ایک ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔ اس میں پیش کی جگہ واؤ استعمال ہوا ہے اور یائے معروف اور یائے مجہول کے نیچے مکمل صورت میں لکھی جانے کی حالت میں بھی دو نقطے موجود ہیں۔ 'گ' کے لیے دوسرا مرکز نہیں دیا گیا۔ جبریل میں ی کے نقطے موجود نہیں ہیں۔ 'گیا' کو چھوٹے کاف سے لکھا گیا ہے اور ی کے دو نقطے غائب ہیں۔ عیسیٰ میں 'ی' کے نقطے فاصلے سے لکھے گئے ہیں۔ 'بھی' کو 'بہی' لکھا گیا ہے، 'تنگ' کو چھوٹے 'ک' اور 'ن' کے ایک نقطے سے تحریر کیا گیا ہے۔ 'آتا ہے' کو بغیر الف مد کے اور 'تا' کے بجائے ایک نقطے سے۔ 'ہے' کی جگہ 'ہی' سے تحریر کیا گیا ہے۔ لفظ 'گریباں' بھی چھوٹے 'ک' سے تحریر ہوا ہے۔ 'تیرے' کو 'تیری' تحریر کیا گیا ہے اور 'ت' کی جگہ ایک نکتہ ہے۔ اور 'ی' کے دو نقطے فاصلے پر درج کیے گئے ہیں۔ 'مرتبہ' میں 'ہے' کو 'ہی' لکھا ہے اور چھوٹی 'ہ' کا شوشہ 'ب' کے نقطے کی طرح دیا گیا ہے جو واضح طور پر سہوِ کتابت ہے۔ 'آگیا' کو 'اکیا' لکھا ہے، 'میں' میں 'ی' کے نقطوں کی جگہ ایک شوشہ ہے۔ 'بھلے' پہلے کی طرح لکھا ہے اور 'ک' کا مرکز نہیں ہے۔ مجھ پر 'مجپر' املائی اجزا کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ہائے مخلوط غائب ہے (ھ) 'ی' کا صرف ایک ہی نقطہ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ مخطوط نگار نقطوں، شوشوں اور مرکز کی علامت کے اندراج میں بہت ہی رواروی سے کام لیتا ہے۔ اور صحتِ املا کا اہتمام نہیں برتتا، جس سے خواندگی میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ 'رکھا' ہائے کہنی دار سے لکھا گیا ہے۔ 'اسے' کو 'اسی' کے طور پر لکھا ہے۔ 'کوچے' کو ایک ساتھ ملا کر لکھا گیا ہے۔ چھوٹی 'ی' اور بڑی 'ے' کے تحت آنے والے نقطے گڑبڑ ہیں۔ صدقے چھوٹی 'ی' سے لکھا ہے۔ 'ق' اور 'ی' کے نقطے تنہا تنہا درج ہوئے ہیں۔ 'گداؤں سے' ایک

ساتھ لکھا گیا ہے اور 'گداؤں سی' تحریر ہوا ہے۔ 'سائیل کو 'ی' کے نقطوں کے بجائے ایک شوشے 'سائل' سے لکھا ہے۔ 'بیمار' میں 'ی' کے دو نقطے غائب ہیں، 'خوب' کے بجائے 'خواب' ہے، 'درماں' کو 'دربان' لکھا ہے۔ 'تب سے' کے بجائے صرف 'تب' لکھا ہے جو واضح طور پر کتابت کی غلطی ہے۔ 'ویران' میں 'ی' کے نقطوں کے بجائے ایک شوشہ نما نکتہ آیا ہے۔

'رائے انور' ممکن ہے یہ لفظ 'روئے انور' ہو اور کتابت کی غلطی سے 'رائے انور' بن گیا ہو، 'ثنا' کے نقطے صحیح طور پر درج نہیں کیے گئے۔ 'ہو' زائد ہے۔ 'منزلیں' میں 'ل' کے بعد 'ی' کے نقطے غائب ہیں۔ 'یکجا' میں 'ی' کے دو نقطوں کے بجائے شوشہ نما ایک ہی نقطہ ہے، 'قرآن' پر مد موجود نہیں ہے، 'اسکے' بجائے 'اسکی' لکھا گیا ہے۔

مخطوطے یا مسودے میں کہیں کہیں شعر اپنی لفظیات اور تحریر کے اعتبار سے غیر موزوں ہو جاتا ہے۔ تو اس کی قیاسی تصحیح ایک مجبوری بن جاتی ہے۔ راقمہ نے یہی روشِ تحریر اختیار کی ہے جو ایک طرح کی مجبوری تھی۔ عارف کے یہاں انتخاب کا مسئلہ ایک سطح پر پیچیدہ اور مشکل ہے اس لیے کہ ان کے رنگِ سخن میں ایک گونہ یکسانیت ہے اور ان کے عمومی رنگِ سخن سے الگ اور ممتاز اسلوب رکھنے والے اشعار ان کی غزلوں میں کم ہی ملتے ہیں۔ اس لیے انتخاب کا مرحلہ مشکل ہو گیا ہے۔

شعر کو سمجھنے کے لیے املائی روشوں پر اس معنی میں دھیان دینا ضروری ہے کہ ان غلط نگاریوں سے بچ کر اور ہٹ کر جو مسودے میں عام ہیں، اپنے طور پر سوچنا ہوتا ہے کہ یہ لفظ کیا ہو سکتا ہے اور اپنے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے وہ اس موقعے پر کیا ہیں۔ اگر یہ روشِ قرأت اور انتخابِ اشعار اختیار نہ کی جاتی تو املائی علامتوں کے ساتھ تو بیشتر مواقع پر شعر کو پڑھنا تقریباً ناممکن ہوتا۔ اس لیے کہ کاتب غلط نویس ہے۔ اپنی طرف سے لکھ جاتا ہے وہاں اس لفظ کے کوئی معنی نہیں ہوتے اور اپنی لفظی اور معنوی نسبتوں کے ساتھ وہ غیر موزوں ہوتا ہے۔ تو اکثر سوچنا پڑتا ہے کہ آخر یہ لفظ کیا ہوگا اس اعتبار سے اس مخطوطے کے انتخاب میں بہت سی دشواریوں کا سامنا ہوا۔

عارف کی اس قلمی کلیات کے انتخاب کی دو صورتیں ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ غزلوں کو پہلے انتخاب کیا جاتا اور ان میں سے پھر اشعار کا انتخاب ہوتا یعنی انتخاب در انتخاب، دوسرا یہ کہ جتنی غزلیں شاملِ کلیات ہیں اور اس عکس میں ان کو دیکھا جا سکتا ہے ان میں سے ہر ایک

غزل کو شاملِ انتخاب کیا جائے اور پانچ شعر ہر غزل سے لیے جائیں جن میں مقطع یا مطلع شامل ہو۔ راقمہ نے بعد والی صورت کو اپنایا ہے کیوں کہ اس طرح قاری کو عارف کی کلیات کی تمام غزلوں کے مطالعے کا موقع فراہم ہو سکے گا۔

کاتب نقطوں، علامتوں اور مرکزوں کی صحیح نگارش کو غیر ضروری سمجھتا ہے۔ اکثر ضروری لفظ چھوٹ جاتے ہیں۔ کاتبِ نسخہ نے نستعلیق و نسخ کے درمیان کا اسلوب اختیار کیا ہے لیکن نقطوں کے سلسلے میں اس کا رویہ خطِ شکستہ کا ہے۔ اور غیر ضروری لفظ مصرعے میں آجاتے ہیں جس کی وجہ سے مصرعے کے بحر و وزن متاثر ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ اس انتخاب میں صحیح قرأت تک پہنچنے کی سعی بھی کی گئی ہے اور تمام غزلوں سے انتخاب کر کے اس کو اصل مجموعۂ کلام سے قریب تر رکھنے کا مقصد بھی پورا کیا گیا ہے، اس میں راقمہ کو کتنی کامیابی ہوئی یہ کہنا مشکل ہے مگر امکانی احتیاط برت لی گئی ہے۔

عارف کی اس کلیات میں کچھ غزلیں ایسی ہیں جو نسبتاً مختصر ہیں اور ایسی بھی جو طویل ہیں لیکن جس زمانے کی یہ شاعری ہے اس دورِ ادب و شعور کو دیکھتے ہوئے ان غزلوں کو بھی مختصر ہی کہنا چاہیے، اس لیے کہ اُس عہد کے بعض شعرا کے یہاں تو پچپن، ساٹھ، ستر شعروں کی غزلیں بھی ہیں۔ لیکن پیچیدہ اور مشکل بحروں میں لکھی گئی غزلیں عارف کے اس دیوان میں نہیں ملتیں۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی مشکل بھاری ردیف اور قافیے کے ساتھ لکھی ہوئی غزل اس دیوان میں شامل ہو گئی ہو۔ فارسی کی بھی کچھ غزلیں درمیان میں آئیں جنھیں انتخاب سے الگ رکھا گیا مگر ان کی تعداد مختصر ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ عارف کو فارسی گوئی کا زیادہ شوق نہیں تھا۔

دیوانِ اول

غزلیات

ردیف: (الف)

(۱)

اللہ، کیا ہے مرتبہ، مجھ سے ذلیل کا
کہتا ہوں بندہ آپ کو ربِّ جلیل کا

آنکھوں سے تیری راہ کو کیونکر نہ طے کروں
ہر میل پر گماں مجھے ہوتا ہے میل کا

جویا ہوں تیرے عشق میں، میں اُس مقام کا
آتا جہاں ہے بے ادبی جبرئیل کا

کیا بن پڑے ہے موئے میانِ بتاں کی بات
منصب ملا جو اس کو خدا کے عدیل کا

جو لوگ تشنہ ہیں تیرے دیدارِ پاک کے
ہے کفر، دیکھنا بھی انھیں سلسبیل کا

صفت کو اس کی تو لبِ لعلِ بتاں پہ دیکھ
صانع کیا ہے خون بھی اپنے قتیل کا

اس امتحاں کی ہم ضُعَفا میں کہاں ہے تاب
کردے ہمارا مرتبہ پہلے خلیل کا

نیرنگیاں یہ قدرتِ حق کی ہیں بے خبر
فرعون کا ہے قصہ، نہ کچھ رودِ نیل کا

دوزخ میں ڈالیو میں عبادت کروں اگر
امیدوار ہوکے ثوابِ جبریل کا

اس بے خبر کو نکتۂ وحدت سے کیا خبر
جس نے سبق پڑھا ہو یہاں قال و قیل کا

اس تنگنائے دہر میں ہوں تنگ اِس قدر
دیکھے کوئی (جو) مجھ کو کہے دل بخیل کا

ڈھانے کو میرا کعبۂ دل مسجدِ ہے دل
قصہ مگر سُنا نہیں اصحابِ فیل کا

بالیں سے سر کو ضعف میں کیونکر اٹھا سکوں
آتا ہے علم کب مجھے جرِّ ثقیل کا

پہنچائے لامکاں پہ بھی عارف ثنائے حق
معلوم پر سبب نہیں کچھ اپنی ڈھیل کا

غزل (۱) میں شعر ۱۱ کے دوسرے مصرعے میں ''جو'' اصل مخطوطے میں کتابت میں چھوٹ گیا تھا۔ اسی غزل کے شعر ۱۴ میں ثُقیل کا املا 'س' سے دیا گیا ہے جب کہ وہ 'ث' سے ہوتا ہے۔

(۲)

اُس میں جب نام محمد زیبِ عنواں ہوگیا
مطلعِ مہر عبادت میرا دیواں ہوگیا

مرتبے میں ہے ابھی مجھ کو ترقی کی امید
گو گدا ہو کر تیرے در کا سلیماں ہوگیا

آگیا میں پہلے تیرے کوچۂ اقدس تلک
چشم دریا بار کا مجھ پر یہ احساں ہوگیا

آستانِ عرش منزل پر ترے رکھا اسے
صدقے اپنے سر کے میں جس کا یہ ساماں ہوگیا

طعن مجھ پر کرتے ہیں کوچے کے باشندے ترے
مانگ کر فردوس تجھ سے میں پشیماں ہوگیا

بھیک مانگے کیوں نہ دریا بھی گداؤں سے ترے
بس کہ ہر سائل کا دامن ابرِ نیساں ہوگیا

جب کہ رضواں بھی سنے تیری شفاعت کی خبر
دیکھ کر وہ وسعتِ جنت کو حیراں ہوگیا

کم نہیں ارشاد تیرا کچھ کلام اللہ سے
جو زباں سے تیری نکلا اپنا ایماں ہوگیا

سرمے کی جا ہوئے گی در کی تیرے خاکِ شفا
چشم بیمارِ بتاں کا خواب درماں ہوگیا

ہیں ملائک محو جب سے طوفِ مرقد میں پڑے
عالمِ علوی سنا ہے تب سے ویراں ہوگیا

روئے انور کی ترے لکھنے لگا جب میں ثنا
خامۂ مشکیں رقم شمعِ فروزاں ہوگیا

عہدِ بعثت میں ترے شاعر کسے کافر کہیں
ہندُو سے خالِ بتاں تک جب مسلماں ہوگیا

راہِ دینِ احمدی کی وہ مجھیے منزلیں
جمع یکجا ہو کے جس کا نام قرآں ہوگیا

خالقِ ارض و سما پر ناز کرسکتا ہے کون
ہاں مگر جو جان و دل سے تجھ پہ قرباں ہوگیا

صورتِ آدم میں جو تو نے کیا اپنا ظہور
کیوں نہ ہو ہر ایک نازاں فخرِ انساں ہوگیا

ہے مذاقِ نام میں بھی اس کے عارف معجزہ
منہ میں بھر آیا جو پانی آبِ حیواں ہوگیا

(۳)

لکھتا ہوں جب کہ نام امیر کا
ہوتا ہوں محو اپنی قلم کی صریر کا

اُس روز بخش کی نہیں بخشش میں کچھ بھی شک
پورا سنا سوال نہ گا ہے فقیر کا

گر باغِ خلق کی ترے اس کو ہوا لگے
ہو زعفراں سے نرخ مُضاعفِ زریر کا

تکمیل جب ہو رفعتِ عرشِ عظیم کی
پایہ ملے جو اس کو علی کے سریر کا

لغزش سے حرف صفحہ پہ غلطاں رہیں سدا
لکھوں جو وصف تیری صفائے ضمیر کا

روح القدس کو غم ہے نہ بت خانہ ہو کہیں
جس جا بدن پہ نقش ہے تیرے حصیر کا

کب کرسکوں میں (آہ) کہ پہنچے ہے تا فلک
کرنے سے پہلے ہاتھ میرے دستگیر کا

عالم ہے فیض یاب تیرے بخت در سے آج ۔۔۔ مقصد ہر ایک حصول ہے برنامہ پیر کا
اعدا جرے ہیں تشنہ گلو ان کے واسطے ۔۔۔ درکار اب ہے تیزیِ پیکانِ تیر کا
کعبہ میں سجدہ کرنے کو تھا جانبِ نجف ۔۔۔ پر آگیا لحاظ سمیع و بصیر کا
کب چھوڑتا غلام ترا اطلسِ فلک ۔۔۔ گر پہننا حرام نہ ہوتا حریر کا
کچھ تیرے سوزِ برقِ غضب سے عجب نہیں ۔۔۔ قعر جہنم نام ہو، گر زمہریر کا
مٹتا نہیں ہے (گر) خطِ تقدیرِ انس و جاں ۔۔۔ شاید لکھا ہوا ہے یہ تیرے دبیر کا
پانی چوئے ہے آب گوہر سے ہزار جا ۔۔۔ عالم ہے تیرے ہاتھ میں ابرِ مطیر کا
عارف جھکے ہے سجدے میں از خود مرا قلم ۔۔۔ لکھتا ہوں جب کہ نام جنابِ امیر کا

(۴)

بن کے انساں اپنے رُتبہ سے فروتر ہوگیا ۔۔۔ آ کے یاں (میں) زیردستِ چرخ واختر ہوگیا
دیدۂ خونبار کا احساں یہ مجھ پر ہوگیا ۔۔۔ بھر دیا لعلوں سے دامن میں تو اخگر ہوگیا
داغِ اِک رشکِ قمر کا لے گئے ہیں اپنے ساتھ ۔۔۔ کنجِ تاریکِ لحد سارا منور ہوگیا
وہاں بھی اس سوزِ نفس نے لب نہ تر ہونے دیا ۔۔۔ خشک لب تک آتے آتے جامِ کوثر ہوگیا
اپنی محفل سے مجھے کیونکر نکالیں گے وہ اب ۔۔۔ کب نظر آتا ہوں میں از بس کہ لاغر ہوگیا
ہر طرف تیری ہی صورت مجھ کو آتی ہے نظر ۔۔۔ کلبۂ احزاں مرا کاخِ مصور ہوگیا
منتظر ہوں در پہ تیرے پر کوئی واقف نہیں ۔۔۔ قامتِ خم گشتہ گویا حلقۂ در ہوگیا
اس سرِ شوریدہ کو ٹکرا کے ہوں کیسا خجل ۔۔۔ سیکڑوں ٹکڑے درِ جاناں کا پتھر ہوگیا
حشر تک ہلنا بھی اس کے در سے اب ممکن نہیں ۔۔۔ شاد ہوں رونے سے بھاری کس قدر سر ہوگیا
سادہ لوحی سے رہے جیسے ترِی فرقت میں ہم ۔۔۔ جو کہا یاروں نے اُس پر ہم کو باور ہوگیا
غم ہو یا خونِ جگر ہو قوت کچھ درکار ہے ۔۔۔ کھالیا فرقت میں تیری جو میسر ہوگیا
وصل کا پھر لطف کیا جب ہوگئے عارف اسیر ۔۔۔ طوق گردن حلقۂ زلفِ مُعنبر ہوگیا

(۵)

چشمِ موراں کوئے جاناں میں مرا گھر ہوگیا ۔۔۔ کیا ہی آسائش میں ہوں میں جب سے لاغر ہوگیا
یہ سمجھ لو چین تم کو بھی نہ دے گا ایک دم ۔۔۔ دل ہمارا جس گھڑی زلفوں میں مُضطر ہوگیا
اس لبِ شیریں کے غم میں کھا کے کیا مر جایئے ۔۔۔ آتے ہی جس کا تصور زہر، شکر ہوگیا

تھے ابھی تو اُس ستم گر پر مرے دعوے بہت
ہائے کیا جلدی سے آخر روزِ محشر ہوگیا

اُس خطا کی ہے سزا، یہ دن بہ دن کا بندگی
ماہ جو گھٹ کر ترے رُخ کے برابر ہوگیا

ہم نے اس تدبیر سے اس کو کیا شب بے حجاب
کچھ کیا ایسا کہ وہ جامے سے باہر ہوگیا

اہلِ دولت کو نہیں دیتے ہیں استعدادِ عشق
اشک ہونے سے رہا جو قطرہ گوہر ہوگیا

کس لیے پھر آرزوئے دشت پیمائی کروں
جبکہ ویراں تر، بیاباں سے، میرا گھر ہوگیا

کثرتِ مشک ونمک سے یہ بھرا ہے اور وہ
جانتا ہے زخمِ دل شاید برآور ہوگیا

خود ہوائے شوق میں اڑنے لگا مکتوبِ شوق
یہ فسونِ عشق ہے کاغذ کبوتر ہوگیا

وعدے کی ٹھیرے بلا سے روزِ محشر ہی سہی
ایک دن تو وصل کا بارے مقرر ہوگیا

وعظ میں کرتے ہیں واعظ تو بہشتوں کا بیان
یا کہیں ان پر بھی ظاہر یار کا گھر ہوگیا

خوبیِ قسمت سے عارفؔ وہ بھی مجھ سے خوش نہیں
میرا دشمن جس لیے سارا میرا گھر ہوگیا

(٦)

بیاں ہے اس میں جو کوہ غمِ جاں کا جاناں کا
کسی سے حرف اٹھ سکتا نہیں ہے میرے دیواں کا

سنا کیجیے کہاں اکسیر اور سرمہ صفاہاں کا
ادب سے نام ہم لیتے ہیں خاکِ کوئے جاناں کا

وہ کافر ہوں کہ برسوں تک، نہاؤں لاکھ دریا سے
پڑے گر، ناگہاں سایہ کہیں مجھ پر مسلماں کا

خدایا فکر کر عالم کی ہم مجبور ہیں دل سے
کہ اب کچھ اور ہے رونا ہماری چشمِ گریاں کا

ہزاروں بار روزِ حشر ہوکر ہوگیا آخر
میں اب تک منتظر بیٹھا ہوں صبحِ شامِ ہجراں کا

پھرے گر وہ نہیں تو منہ اُدھر جاتا ہے کیوں اس کا
میں اس کے سامنے تب نام لیتا ہوں، سلیماں کا

ملائک کیوں نہ قائل ہوں کہ سجدہ کرتے آدم کو
طرف داری میں جب حق نے ہے پہنا جامہ انساں کا

یہاں تک چلتے چلتے تنگ اپنی جان سے آئی
کہ لب پر آگیا ہے (دم) تری شمشیرِ بُرّاں کا

گھڑی مسجد میں جاتا ہوں گھڑی میخانے کے در پر
میری توبہ کا عالم ہوگیا ہے تیرے پیماں کا

ذرا آنے دو فصلِ گل کہ (سر) ٹکراتے ٹکراتے
نشاں باقی نہ رکھوں گا در و دیوارِ زنداں کا

نہیں گنجائشِ اظہار حسرت ناتوانی میں
اگر کاٹوں نشاں تک بھی نہ ہو ہاتھوں پہ دنداں کا

غزل (۵) کے آٹھویں شعر کے مضمون کو غالب نے بھی باندھا ہے:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہماری خاک سے اُس کو کدورت کب کی تھی یارب (کذا) سکھایا ہے اُسے چلنا اٹھا کر کس نے داماں کا
نہ پہنچا کاروانِ اشک عارفؔ جا کے یوسف تک یونہی بے کار تھا رونا جو دیکھا پیرِ کنعاں کا

(۷)

نہ کر میرے شبستاں، میں گمان شمعِ فروزاں کا یہ روشن دل پہ ہے مانندِ مشعلِ داغ ہجراں کا
سدا رہنے لگا ہے تو جو میری جان کا دشمن کہیں تجھ پر بھی سایہ پڑ گیا ہے چرخ گرداں کا
خبر کب بے خودی میں ہے کسی کے آنے جانے کی نہ کچھ ہے وصل کی شادی نہ کچھ ہے رنج ہجراں کا
تن پرداغ کی دولت رہے کل اسکے گھر میں ہم (کذا) رہا دھوکا جو اس محفل میں شب سروِ چراغاں کا
کہاں سے آ گئے اس میں ہنر رفتار کے تیری کہ چلنا قتل کرنا ہے تری شمشیرِ بُرّاں کا
وہ یوسف قید کر کے مجھ کو پہنچے گا کہاں دیکھوں (لیے) جاتا ہے خود دل میں وہ اپنے نام زنداں کا
شگافِ سینہ کو میرے رفو کر جلد اے ہمدم کہ پردہ فاش ہوتا ہے میرے غم ہائے پنہاں کا
ضعیف و ناتواں ہو کر ہوا پر ہم لگے چلنے ہوئے جب مور سے کم تر ملا (رُتبہ) سلیماں کا
ترقی پھر نہ ہو کیونکر ہماری تیرہ بختی کو کہ دامن اب تو پکڑا ہے شب تاریک ہجراں کا
گماں مت کر کہ میرا زخمِ دل خشکی پر آیا ہے ہوا ہے تشنہ پھر بیچارہ آبِ تیغِ بُرّاں کا
نبوت اور ہے اور جذب الفت اور ہے غافل نہ یوسف کی جدائی میں چلا بس پیر کنعاں کا
کوئی تیری طرح صحرا بہ صحرا خاک کیا چھانے مصیبت ہے خضر واقعہ میں پینا آبِ حیواں کا
میرے دل کو دیے ہیں اس نے لاکھوں گنجِ غم مخفی کروں کیا شکر میں اُس کی نوازش ہائے پنہاں کا
سمجھنی آپ میں اور اس میں دوری کفر ہے عارفؔ زباں کاٹے ادیبِ عشق گر لوں نام ہجراں کا

(۸)

اس پہ کرنا میرے نالوں نے اثر چھوڑ دیا مجھ کو، ایک لطف کی کر کے، جو نظر چھوڑ دیا
سونپ کر خانہ دل غم کو کدھر جاتے ہو پھر نہ پاؤ گے اگر اُس نے یہ گھر چھوڑ دیا
اشکِ سوزاں نے جلائے مرے، لاکھوں دامن پوچھتا میں نے تو اب دیدۂ تر چھوڑ دیا
بخیہ گر جل گئے کیا ہاتھ ترے سوزش سے کرتے کرتے جو رفو چاکِ جگر چھوڑ دیا
گلشنِ دہر میں خامی نے بچایا ہم کو دیکھ کر خام کدورت نے ثمر چھوڑ دیا

غزل (۷) میں شعر ۶ کے دوسرے مصرعے میں (مخطوطے میں) ''لیا جاتا ہے'' لکھا ہے، نیز شعر ۸ میں 'زینہ' لکھا گیا ہے۔

لے گئے سامنے حاکم کے مرے قاتل کو
اس کو اس نے بھی سمجھ، خونِ پدر چھوڑ دیا

نیک و بد کچھ نظر آتا نہیں وہ وحشت ہے
پردہ غفلت کا میرے پیشِ نظر چھوڑ دیا

کوچۂ زلف کو کترا کے گیا دلِ رخ پر
اس نے وہ رستۂ پُرخوف و خطر چھوڑ دیا

اے فلک خانہ خرابی کی ہے پروا کس کو
دشت میں رہتے ہیں مدت ہوئی گھر چھوڑ دیا

مجھ پہ احسان صبا کا ہے کہ کوچہ میں ترے
خاک کو میری سر راہ گزر چھوڑ دیا

مجھ کو اے آہ تعجب ہے کہ کاشانۂ غیر
کل شبِ ہجر نے برسا کے شرر چھوڑ دیا

بھر گیا دل مرا ایک چیز کو کھاتے کھاتے
خونِ دل کھائیں گے اب خونِ جگر چھوڑ دیا

بوجھ سے آپ ہی مرجائے گا کیوں ہو بدنام
یہ سمجھ کر بتِ سفاک نے سر چھوڑ دیا

نہیں تیر نگہِ یار سے بچنا ممکن
کل ہے موجود وہ دن آج اگر چھوڑ دیا

آگیا دل میں جو عالم کا مسخر کرنا
زلف کو چہرے پہ ہنگامِ سحر چھوڑ دیا

یہ نہیں (ہے) رہِ بت خانہ کدھر جاتا ہے
آج سے ہم نے ترا ساتھ خضر چھوڑ دیا

کردیا تیروں سے چھلنی مجھے سارا لیکن
خون ہونے کے لیے اس نے جگر چھوڑ دیا

ساتھ دیکھا تھا اسے کل تو تیرے اے مجنوں
آج اس عارفِ وحشی کو کدھر چھوڑ دیا

(۹)

ہم سے بولا وہ کبھی رات کو اُلٹا اُلٹا
ہم نے، پر آگے کسی کے نہ وہ، اصلا اُلٹا

کیوں یہ آنکھیں تیری بیمار سدا رہتی ہیں
ان پہ جادو نہ کہیں ہووے انھیں کا اُلٹا

خود پریشاں ہوئی سودائی بنانے کو مجھے
ہوگیا آپ تیری زلف کو سودا اُلٹا

مے دوشینہ کا کیا نشہ ہے اب تک ہم کو
پیراہن ہو کے جو بیدار، یہ پہنا اُلٹا

ان بلاؤں کے اٹھانے کی تجھے تاب کہاں
اے خضر تو مرے ویرانے سے پھر جا اُلٹا

کیا دکھاؤں گا خدا کو دلِ نالاں صورت
کہیں نالوں نے اگر عرشِ معلیٰ اُلٹا

جم گئی میرے دمِ سرد کی تاثیر سے مے
نہ گری بوند بھی جب شیشۂ صہبا اُلٹا

جب تو شاید میری آنکھوں سے تھمے موجِ سرشک
جوش میں آکے جو بہنے لگے دریا اُلٹا

غزل (۸) کے چھٹے شعر کے دوسرے مصرعے میں 'خونِ پدر سمجھ کر چھوڑ دیا' استعمال ہوا ہے جو ایک محاورہ ہے اور بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ شعر سولہ میں 'ہے' نہیں لکھا گیا۔ شعر سترہ میں 'خون ہونے کے لیے' آیا ہے جب کہ 'خون رونے کے لیے' آنا چاہیے۔

شیر وحشت میں زبس کاٹنے دوڑا مجھ کو — آتے آتے میں پھرا جانبِ صحرا اُلٹا
جنسِ دل آپ کو اک بوسے پہ مہنگی ہی سہی — پھر نہ لے کے مناسب ہنس سودا اُلٹا
قیس، تاثیر نہیں تیری حُدی خوانی میں — مست ناقے (نے) نہ کب محمل لیلیٰ اُلٹا
ہوگیا گنجِ لحد آج ہمارا روشن — کیا کہیں اس نے نقابِ رخِ زیبا اُلٹا
کس لیے اس سے الجھتا ہے سزا ہے دل کی — اس کو لٹکائے تیری زلفِ چلیپا اُلٹا
پاس سے اس کے تو بچ کر نہیں آنا ممکن — نامہ بر کیا کہیں رستہ سے پھر، آیا اُلٹا
دل کو کیا ہاتھ میں لاویں وہ کسی کے ہمدم — ہاتھ پہچانتے اب تک نہیں سیدھا اُلٹا
ساتھ کھاتا ہے مسلمانوں کے کیونکر عارف — بارہا اس کا گریبان تو دیکھا اُلٹا

(۱۰)

ساقیا دیکھ تو کس رنگ سے چھائی ہے گھٹا — مژدۂ بادہ کشی دینے کو آئی ہے گھٹا
یاد آئی تجھے دیکھے سے مئے آتش رنگ — دل میں کیا آگ مرے تو نے لگائی ہے گھٹا
مہ و خورشید کی صورت کو ترستا ہے جہاں — دودِ آہِ دلِ سوزاں سے، جو چھائی ہے گھٹا
لگ گئیں سوئے فلک بادہ کشوں کی آنکھیں — یوں تو مشتاق تری ساری خدائی ہے گھٹا
ہر بُنِ منہ سے ٹپکتا ہے پسینہ اس کا — دور سے آج زبس دوڑ کے آئی ہے گھٹا
بڑھ گیا دل جو میرا یار کے آجانے سے — آج البتہ ذرا رنج جدائی ہے گھٹا
بارشِ اشک سے بجھتی ہے کوئی آتشِ دل — اُس کے شعلے نے تو سو بار جلائی ہے گھٹا
کون لیتا ہے بھلا ہم سے پیاسوں کی خبر — تشنگی تو نے میری آ کے بجھائی ہے گھٹا
ہائے کس منہ سے تجھے شکل دکھاویں اپنی — مے کی پینے سے قسم ہم نے تو کھائی ہے گھٹا
کھِل گئے غنچۂ دل دیکھ برسنے کی بہار — سچ تو یہ ہے کہ تری عقدہ کشائی ہے گھٹا
پھر بھی تو رونے کا سرمایہ رکھ اپنے دل میں — سب کہانی تجھے کب دل کی سنائی ہے گھٹا
آب پاشی میری آنکھوں کی طرف سے کریو — گھر تلک تجھ کو اگر اس کی رسائی ہے گھٹا
رودیں ہم جب سے کہ بجلی کی طرح مضطر ہیں — تو نے رونے کی جھڑی کیوں یہ لگائی ہے گھٹا
بے کسوں کا نہیں کوئی تو خدا ہے عارف — دیکھ رونے کو میری خاک پر آئی ہے گھٹا

غزل (۹) کے گیارہویں شعر میں 'نے' کا لفظ مخطوطے میں موجود نہیں ہے۔

(۱۱)

کیا رُتبہ ہے شکستِ دلِ داد خواہ، کا
منصب جسے ملا تری طرفِ کُلاہ کا

کب خاک چشمِ غیر میں ڈالے وہ رشک سے
جو شخص ہووے خاک نشیں تری راہ کا

دل میں اتر گئی پہ نہیں دل کو کچھ گزند
کیا یہ نیام ہے تری تیغِ نگاہ کا

اِس چرخِ سبزفام کی گردش کو دیکھ کر
طالب ہوا خدا سے نہ میں عزّ وجاہ کا

عارف کی کیا دبیرِ فلک نے پڑھی غزل
اِک شور چرخ پر جو ہوا واہ واہ کا

(۱۲)

جان کہتا ہوں تجھے خط پہ فدا کیا کرتا
پاسخِ نامہ اگر تو مجھے انشا کرتا

نہ ہوا وقت میں اس کشتۂ غم کے میرے
کہ نہ پھر دعویِ اعجاز مسیحا کرتا

عشوہ و غمزہ نہ تھا کیا کوئی خنجر کے سوا
تجھ سے پھر کون میرے خون کا دعویٰ کرتا

بات کرنے کا ترے سامنے ہے حکم مگر
ورنہ قُلقُل نہ کبھو بزم میں مینا کرتا

پردۂ چشم میری ہوگئے حائل عارف
فی الحقیقت وہ کسی سے نہیں پردہ کرتا

(۱۳)

ہووے گر اِس تفتہ جاں کا تیرے مدفن زیرِ پا
تو یہ جانے آگیا شاید کہ گُلخن زیرِ پا

سیم وزر کُھل جائے اس کی گرمیِ رفتار سے
اتفاقاً گر کہیں آجائے مخزن زیرِ پا

ہم وہ لاغر ہیں نشاں بھی پھر نہ پاوے گا کوئی
آگیا اک مور کا جس وقت روزن زیرِ پا

صاحب تمکیں رہے افتادگی سے بے خطر
کوہ کے آتا سنا ہے کس نے دامن زیرِ پا

مت اٹھا بہرِ خدا عارف کے سینے سے قدم
دل تڑپنے سے ہرا رہتا ہے ایمن زیرِ پا

(۱۴)

تم نہ گھبراؤ نہ کانٹا ہے نہ سوزن زیرِ پا
ہوگیا ہوں غم سے لاغر، ہے میرا تن زیرِ پا

دھوم ہے قاتل کی میرے ماں سے ماہی تلک
شور ہے بالائے سر آوازِ شیون زیرِ پا

طائر جاں کا نشیمن شاخِ نخلِ قدس ہے
اس تنِ خاکی کا میرے گو ہے مسکن زیرِ پا

منزلِ الفت کو میں نے طے کیا ہے سر کے بل
آبلے کیا دیکھتے ہو مشفقِ من زیرِ پا

فرش ہیں عارف کی آنکھیں کوئی منہ دیکھے پلک
تم نہ گھبراؤ نہ کانٹا ہے نہ سوزن زیرِ پا

(۱۵)

وہ حال ہے ترے اِس حزیں کا کہ نقش گویا ہوا زمیں کا
نہ کہہ رہا ہے نہ یہ کہیں کا، جہاں کے تنہا ہوا وہیں کا

سنے وہ، کب، کچھ مری زبانی کہ اُس پہ ہے ختم بدگمانی
وہ بات اپنی پہ اس کو لانی جو ذکر کیجیے کبھو کہیں کا

وہ ضد ہے میرے سے بدگماں کو کہ جس سے راحت کو میری جانے
کہ بدلے وہ سنگِ آستاں کو جو نقش ہووے میری جبیں کا

ذہن تو اس کا ہے غنچۂ گل پہ کہیے دانتوں کو بے تامّل
کہ موتیوں سے بھرا ہے بالکل ایک دھوکا ہے یاسمین کا

کیا جو عارفؔ نے نالہ یکسر تو آسماں پر جلے سب اختر
کہاں ہے گردوں رگراوہ جل کر دُخاں ہے یہ آہِ آتشیں کا

(۱۶)

نہ آئے سامنے میرے اگر نہیں آتا
مجھے تو اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

بلا اُسے بھی تو کہتے ہیں لوگ عالم میں
عجب ہے کس لیے وہ میرے گھر نہیں آتا

وہ میرے سامنے طوبیٰ کو قد سے ماپ چکے
انھوں کے نامِ خدا، تا کمر نہیں آتا

نہ بے خطر رہو مجھ سے کہ دردمندوں کے
لبوں پہ نالہ کوئی بے خطر نہیں آتا

ڈرا دیا ہے کسی نے اسے مگر عارفؔ
میرے خرابے کی جانب خضر نہیں آتا

(۱۷)

جس کا نہ میں رقیب ہوا، آشنا ہوا
جلتا ہوں اب تلک میری غیرت کو کیا ہوا

پھرتا ہوں اپنے خون میں میں تو بہا ہوا
اُس پُرجفا نے یہ بھی نہ جانا کہ کیا ہوا

مرقوم اس میں حال جو ہے میرے جوش کا
جاتا ہے لے کے نامے کو قاصد اڑا ہوا

محفل میں تیری مجھ کو نہ دیکھا کسی نے شب
پردے میں واہ واہ کے تھا میں چھپا ہوا

تخفیف ہے مرض میں جواب لگ گئی ہے آنکھ
مرنا ہمارے حق میں تو عارفؔ دوا ہوا

(۱۸)

سچ ہے جو دل کو ہم نے لگایا بُرا ہوا
پر کیا علاج کیجیے کہ جو کچھ ہوا بُرا ہوا

شب زندہ دار ہووے گا عالم بھلا ہوا — مشہور جو فسانہ ہوا جا بہ جا ہوا
ہے بار منت اُس کا پڑا چشم اشک پر — یہ ابر کھڑا ہے جو ایسا جھکا ہوا
کیونکر کروں نہ ناز کہ تصویر ہوگیا — لگتا ہوں جیسے میں تیری صورت کھڑا ہوا
ہاتھوں میں تیرے، دے کے میرا پردہ رہ گیا — مشہور خون ہو کے یہ رنگِ حنا ہوا
کرنے لگی ہے چھیڑ جو زلفِ یار سے — سودا تجھے بھی کیا کہیں بادِ صبا ہوا
کیونکر عزیز رکھوں نہ وحشت میں چاک کو — دامن سے میرے اب تو ہے یہ ہی لگا ہوا
ہوتا ہے یہ اُدھر کو وہ ہوتا ہے جس طرف — دل بے قرار ہونے سے قبلہ نما ہوا
یعقوب سینہ ریش نے خالی کیا ہے دل — سارا جو کارواں ہے لہو میں بھرا ہو
ظاہر میں ہم مرے نہیں پر دم نکل گیا — کچھ دیکھتے ہی اس کو یہ کیا ماجرا ہوا
کچھ میرا مرتبہ بھی شہیدوں سے کم نہیں — دل سے فدائے نامِ شہِ کربلا ہوا
کیا خوف مجھ کو اپنے گناہوں سے چاہیے — محشر میں جب شفیع میرا مصطفیٰ ہوا
کیوں ساتویں فلک پہ نہ میرا دماغ ہو — آکر جو آستاں پہ تیرے جبہ سا ہوا
وہ سجدہ گاہِ حور و ملائک ہوا مکاں — جس جس مقام پر کہ تیرا نقشِ پا ہوا
عارفؔ کی کیا مجال کہ لکھے تیری ثنا — شاہا تو وہ ہے جس کا ثنا گر خدا ہو

(۱۹)

گرنا وہیں کھاکے غش اس کو اگر دیکھنا — ہم کو میسّر کہاں بھر کے نظر دیکھنا
زلف میں تیری پھنسے اور وہ بھی تا کمر — تس پہ بھی ممکن نہیں موئے کمر دیکھنا
اس لبِ میگوں کا دور ایک ذرا آنے دو — دامنِ عیسیٰ تلک پھر تو ہو تر دیکھنا
لختِ دل اور اشک کی اس کو نظر ہو تو ہو — ننگ ہے جس چشم کو لعل و گوہر دیکھنا
خیر ڈبوئے اگر تم نے یہ ساتوں فلک — آگے ہے جائے ادب دیدۂ تر دیکھنا
دن بھی تو میرا یہ کم کچھ شبِ غم سے نہیں — ہے میری قسمت میں کب نورِ سحر دیکھنا
زہر میرے حق میں اور گھولتے ہو کس لیے — آپ کا کافی ہے بس ایک نظر دیکھنا
اس رخِ پُرنور سے ہووے اگر مستنیر — جائے مہِ نو، سدا، پھر تو قمر دیکھنا
وعدہ کیا تھا کبھی اُس نے جو آنے کا اِدھر — شغل ہمیں ہوگیا جانبِ در دیکھنا
مجھ کو بلاتا ہے کب بزم میں وہ ہمدموں — پر کسی تقریب سے ذکر تو کر دیکھنا

سیر نہیں اب تلک .... — اس کا ستم دیکھنا میرا جگر دیکھنا

پھر وہی اغیار ہیں اور وہی اطوار ہیں — آپ (کا) اقرار تھا یہ بھی اِدھر دیکھنا

رحم نہ آوے اُسے اس لیے ہوں محترز — تن سے جدا ہو تو پھر پانو پہ سر دیکھنا

دیکھ کے یکبارگی اس کو یہ بے خود ہوئے — پھر نہ ہوا حشر تک بار دگر دیکھنا

ہم کوئی عارف بھلا قبلے کے پابند ہیں — سجدے میں گرنا، اُدھر اس کو جدھر دیکھنا

(۲۰)

دل جو کہتے ہیں کہ ہلتا ہے بہانا ہوگا — اون کو منظور میرا دل سے گرانا ہوگا

رخصت اے دشتِ جنوں موسمِ گل جاتا ہے — ساتھ پھر آئیں گے اپنا گر آنا ہوگا

دل دیا تھا انھیں ہم نے نظرِ شفقت پر — یہ نہ سمجھے تھے کہ تیروں کا نشانہ ہوگا

جان لو یہ بھی کہ چوروں میں گنے جاؤ گے — یونہی (یونہیں) آنکھوں کو جو ہر بار چرانا ہوگا

اس (دلِ) تنگ میں آتا تو ہے، تواے غمِ یار — پر یہ حیراں ہوں کہاں میرا ٹھکانا ہوگا

دن کو سونے سے تو بہتر ہے کہ تکلیف نہ ہو — حال اپنا تجھے کچھ شب کو سنانا ہوگا

چھوڑ کر پھرتے ہیں زلفیں وہ بلا شانوں پر — ان کو منظور میرے دل کا پھنسانا ہوگا

ضعف میں سر نہ اٹھے فکر ہے اس کا لیکن — کیا کریں گے جو ہمیں رنج اٹھانا ہوگا

دیکھ تو میٹھی نگاہوں سے رقیبوں کی طرف — ایک دن زہر تیرے ہاتھوں سے کھانا ہوگا

جان و دل دونوں ہیں بیتاب غمِ فرقت میں — ساتھ کس کس کے مجھے سر کو پھرانا ہوگا

خیر وہ دل سے گرادیں تواٹھیں گے وہاں سے — چوٹ لگنے کا ہمیں صاف بہانا ہوگا

پا ہی لیویں گے دلِ گمشدہ کو اپنے — اس کے کوچے کی اگر خاک کو چھانا ہوگا

لے خبر غور سے دل ہائے شکستہ کی خلیل — اپنے کعبہ (کو) بھی افضل نہ بنانا ہوگا

خضر کے ساتھ چلے آئے تھے ہم اے ساقی — اپنا پھر کاہے کو میخانہ میں آنا ہوگا

ان کو ہم دیویں گے اپنے دلِ سوزاں میں جگہ — ہم کو منظور جو غیروں کا جلانا ہوگا

شیخ کافر مجھے کہتا ہے برہمن مومن — ایسی باتوں سے کہاں میرا ٹھکانا ہوگا

جان کہتی ہے میری دیکھ کے قاصد کو یہی — اس طرف کیا یہ اکیلا ہی روانہ ہوگا

غزل (۲۰) کا دوسرا، تیسرا شعر اور مقطع سمجھ میں نہیں آسکا۔

(۲۱)

خیر بہتر ہے تیرے کوچے سے کل جاؤں گا
گو نہ نکلا کوئی ارماں تو نکل جاؤں گا

کیوں ڈروں سوزِ غم یار سے اتنا اے دل
موم کا تو نہیں کچھ میں کہ پگھل جاؤں گا

پاؤں کے دھوکے میں ایسا نہ ہو سر بچ جاوے
اس کے کوچے میں کبھی سر کے نہ بل جاؤں گا

تنگ گو ہاتھ سے وحشت کے ہوں پر ہوں گھر میں
جیب و داماں تو نہیں میں کہ نکل جاؤں گا

مجھ کو دیدار دکھانے میں شامل کیا ہے
شجرِ طور نہیں کہ میں جل جاؤں گا

تم کو نفرت ہی اگر کچھ میری صورت سے (ہے)
حالِ دوراں کی طرح دم میں بدل جاؤں گا

کیا ٹھکانا ہے جب دل سے گرایا اُس نے
یہ نہیں عرش سے گرتا کہ سنبھل جاؤں گا

دم یہ کہتا ہے کہ میں دم میں نکل جاؤں گا
من کا ہر آن یہ کہتا ہے کہ ڈھل جاؤں گا

مجھ سے وحشی بھی کہیں قید ہوا کرتے ہیں
باہر اپنے سے کوئی دم میں نکل جاؤں گا

کس لیے میرے اٹھانے میں تردّد اتنا
کوہِ غم تو نہیں خود بزم سے ٹل جاؤں گا

اس کے درباں کے ملانے سے ہے یہ تو حاصل
رو نہ آنکھیں میں درِ یار پہ مل جاؤں گا

خم کے خم جھونک دے تو منہ میں میرے اے ساقی
میں تنگ ظرف نہیں ہوں کہ اُبل جاؤں گا

ہوگی معلوم خوش الحانیِ بلبل عارف
آج میں باغ میں پڑھنے کو غزل جاؤں گا

(۲۲)

حال عریانی کا میری جب رقم ہوجائے گا
محو، نقشِ تارِ مطر یک قلم ہوجائے گا

کعبۂ دل پر بتوں کی اور کچھ نیت ہے اب
کوئی دن میں دیکھنا بیت الصنم ہوجائے گا

قامتِ خم کا میرے (ان) سے الجھنا اے حسین
زلف میں تیری، سوا ایک اور خم ہوجائے گا

یارب اس پر اس کی تاثیرِ نگاہ ظاہر نہ ہو
وہ کرے گا رحم اور مجھ پر ستم ہوجائے گا

ہم تو جب بھی مکر سے خالی نہ جائیں گے اُسے
مکہ میں عارف اگر شیخِ حرم ہوجائے گا

(۲۳)

لکھتا ہوں وصف اس کی جو میں رخ کی تاب کا
مطلع میں قافیہ ہے برے آفتاب کا

بے غم ہوں میں کہ میرے گناہ بے حساب ہیں
ہرگز خطرہ نہیں مجھے روزِ حساب کا

محروم ہیں سدا یہ تنگ ظرف دہر میں
خالی پڑا ہے بحر میں ساغر حباب کا

ایمن ہیں ہر بلا سے سدا صاحبِ کرم
جلتا نہیں ہے برق سے دامن سحاب کا

انبارِ خشت دور سے آتا ہے جو نظر ہووے گا گھر یہ عارفِ خانہ خراب کا

(۲۴)

اب ایسا آساں نہیں در کا ترے درباں ہونا عقل سے دور ہے انساں (کا) رضواں ہونا
مشق آئینے نے ہر چند بہت کی اس میں پر بری طرح نہ آیا اُسے حیراں ہونا
فتنۂ روزِ قیامت کا خطر کیا ہووے جب نہیں جانتے اختر شبِ ہجراں ہونا
دلِ مجروح کا یہ شور مچانا تو تھمے چاہیے پاس میرے ایک نمک داں ہونا
اٹھ کہ میں دیر سے یوں کعبہ کو جاؤں عارفؔ کیا کروں جب کہ ہو قسمت میں مسلماں ہونا
جو وہ چاہے سو کہے جس کا نہ ہو کوئی جواب زیب دیتا ہے اُسے آپ پہ نازاں ہونا
تو نہ یوسف ہے نہ لیلیٰ ہے نہ شیریں اے دل تیرا کیا رتبہ ہے اس شوخ پر قرباں ہونا

(۲۵)

کیا غضب ہے کہ میرا مجھ سے وہ دلبر توڑا مجھ پہ کیا تو نے ستم چرخِ ستم گر توڑا
سخت جانوں کو جلانے کے سوا کیا تدبیر مفت کیوں قاتلِ سفاک نے خنجر توڑا
آ گیا واں جو کسی کے لبِ شیریں کا خیال جامِ کوثر کو اٹھا کر لبِ کوثر توڑا
اٹھ گیا چل کے ترے در سے میں گو کعبہ کو پر یہ زنار وہاں بھی بتِ کافر توڑا
کیا درِ یار طلب پہنچے ہیں انساں عارفؔ اُس کے درباں کو ادھر دے کے بہت زر توڑا

(۲۶)

رات یادِ نگہِ یار نے سونے نہ دیا (مطلع) شادیٔ وعدۂ دلدار نے سونے نہ دیا
ہوگئی صبح درِ خانہ پہ بیٹھے بیٹھے فتنۂ چشمِ فسوں کار نے سونے نہ دیا
شب وہ بے کل رہے کاکل میں پھنسا کر اُسکو شور و فریادِ دلِ زار نے سونے نہ دیا
تھا شبِ ہجر میں ایک خون کا دریا جاری ایک پل دیدۂ خوں بار نے سونے نہ دیا
رات بھر خونِ جگر ہم نے کیا ہے عارفؔ (مقطع) فکرِ رنگینیٔ اشعار نے سونے نہ دیا
اس تنِ زار پہ ایک بارِ گراں ہے یہ بھی یار کے سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا
اب تو کردے ویں رہا وہ مجھے شاید کہ انھیں میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

(۲۷)

اثر کیا ہے، یہ، اے آہِ نارسا کیسا وہ مجھ پہ رات کو اُلٹا ہوا، خفا کیا

جو پوچھیے تو ہے اِک رنگ کا اثر یہ بھی — ہمارے رونے پہ وہ رشکِ گل ہنسا کیسا
بتوں کو دوں جو میں ہر بات پر خدا کی قسم — یہ کیا سمجھتے ہیں یارو کہ ہے خدا کیسا
وہ دن گئے جو مخاطب ذرا وہ ہوتے تھے — اب ان سے نامہ و پیغام اے صبا کیسا
سقیم حال تھا کچھ شام تک تو، اے عارفؔ — وہ رات کو نہیں معلوم ہے رہا کیسا

(۲۸)

بتا رہا ہے منجم بھلا بُرا کیسا — خدا ہی جانے کہ قسمت کا ہے لکھا کیسا
شبِ وصال میں بستر تلک نہیں پیدا — تمھارے عشق میں اپنا یہ گھر لٹا کیسا
کہیں یہی تو دلِ گمشدہ نہ ہو میرا — یہ غنچہ سا ہے پڑا تیرے زیرِ پا کیسا
ہوائے بوسہ میں جنبش ہے بدگماں مت ہو — لبوں پہ میرے بھلا شکوہ و گِلا کیسا
لگائے آپ ہیں دل اب تو حضرتِ عارفؔ — ولے اٹھاؤ گے تم دیکھنا مزا کیسا

(۲۹)

اچھا ہوا کہ دم شبِ ہجراں نکل گیا — دشوار تھا یہ کام پر آساں نکل گیا
بک بک سے ناصحوں کی ہوا یہ تو فائدہ — میں گھر سے چاک کرکے گریباں نکل گیا
پھر دیکھنا کہ خضر پھرے گا بہا بہا — گر سوئے دشت میں کبھی گریاں نکل گیا
خوبی صفائے دل کی ہماری یہ جانیے — سینے کے پار صاف جو پیکاں نکل گیا
ہنگامے کیسے رہتے ہیں اپنے سبب سے واں — ہم سے ہی نامِ کوچۂ جاناں نکل گیا
فرقت میں کارِ وصل لیا واہ واہ سے — ہر آہِ دل کے ساتھ اک ارماں نکل گیا
بہتر ہوا کہ آئے وہ محفل میں بے نقاب — عارفؔ غرورِ ماہِ جبیناں نکل گیا

(۳۰)

وہ جس طرف سے فتنۂ دوراں نکل گیا — ہر ایک چاک کرکے گریباں نکل گیا
صد چاک ہو کے شانہ بنا دل تو غم نہیں — پر بل تو تیرا کاکلِ پیچاں نکل گیا
اس ضعف کا بُرا ہو کہ ناکام رہ گئے — آج اس کا اپنے ہاتھ (سے) داماں نکل گیا
کیوں کر نہ فکر کیجیے گدازِ جگر کا اب — سب خونِ دل تو دیدۂ گریاں نکل گیا
افسانہ سوزِ دل کا میرے جانتا تھا کون — میری زبان سے شمعِ شبستاں نکل گیا
اُمڈا یہ دل کہ زور میں اشکوں کے آن کر — آنکھوں کی راہ یار کا پیکاں نکل گیا

عارفؔ کہیں نظر نہیں آتا ہے ان دنوں (مقطع) کیا جانے کس طرف کو وہ ناداں نکل گیا

(۳۱)

ہم کو اس شوخ نے کل در تلک آنے نہ دیا (مطلع) در و دیوار کو بھی حال سنانے نہ دیا
پردۂ چشم میں ہر دم تو چھپائے آنسو بے قراری نے مجھے راز چھپانے نہ دیا
مجھ کو آلودہ رکھا اِس میری گمراہی نے غرقِ شرمِ گنہ بھی تو بہانے نہ دیا
تیرے کہنے سے میں اب لاؤں کہاں سے ناصح صبر جب اس دلِ مضطر کو خدا نے نہ دیا
منع ہے بس کہ خور و خواب ہمیں غم میں ترے مر کے سونے نہ دیا زہر بھی کھانے نہ دیا
ہوں ستم گر میں جفاؤں سے تری شرمندہ ناتوانی نے مجھے سر بھی اٹھانے نہ دیا
دم کا آنا تو بڑی بات ہے لب پر عارفؔ (مقطع) ضعف نے حرفِ شکایت کبھی آنے نہ دیا

(۳۲)

دایم ہے تیرے طالبِ دیدار کا رونا کیا پاک گناہ کو کرے ایک بار کا رونا
آخر کو میرے زخم کہیں ہوگئے ناسور بے وجہ نہیں ہے دلِ افگار کا رونا
آگے سے میری آنکھوں کے اک اٹھ گئی محفل رووں میں اگر ہو مجھے دو چار کا رونا
ڈوبے عَرَقِ شرم میں بس ابرِ بہار دیکھے جو میری چشم گوہر بار کا رونا
رونا میرے نزدیک تو ایک شغل ہے عارفؔ اور ہم کو پڑا ہے در و دیوار کا رونا

(۳۳)

جان تک بھی مجھ سے گروہ بے مروت مانگتا وا (جب) التعزیر تھا ایک دم جو مہلت مانگتا
ابرِ تر میں اس قدر ہوتی کہاں دریا دلی دیدۂ پُرنم سے میرے گر نہ ہمت مانگتا
جو نوائے بلبل گلشن سے ہووے بدماغ اس کے آگے بولنے کی کیا اجازت مانگتا
گر ازَل میں مجھ کو دیتے مانگنے کا اختیار خضر کی عمر اور میخانے کی خدمت مانگتا
رنجِ ہجرِ یار میں عارفؔ تھی مرجانے کی جا گر اعانت چرخ سے وقتِ مصیبت مانگتا

(۳۴)

جہاں میں (بس) دلِ سوزاں ہمارے کام آیا کہ پک گیا جو ہمیں کچھ خیالِ خام آیا
بہ صورتِ دلِ عشاق بس گئے غنچے سحر کہاں؟ جو چمن میں وہ خوش خرام آیا
خدا بچائے بلا سے کہ عشقِ غارت گر دیارِ دل میں میرے بہرِ انتظام آیا

یہ آمد، آمدِ فصلِ بہار کہتی ہے
نوید، بادہ کشاں کو کہ دورِ جام آیا
حَذَر کر اب تو کہیں لہو ولعب سے عارف
سفید بال ہوئے موت کا پیام آیا

(۳۵)

ہزار مجھ پہ وہ منہ شوخ بے حجاب آیا
بنا وہ بوسہ جو لب پہ میرے جواب آیا
میں منتظر ہوں قیامت کا قبر سے اٹھ کر
جو پہنچے اب بھی تو قاصد بہت شتاب آیا
خوشی سے کیا درِ میخانے پر کروں خیرات
وہ دن ہے آج، پینے کو میں شراب آیا
فلک پہ جب سے ہمارے غبار کا ہے دماغ
یہ تھوڑی دور جو تیرے (وہ) ہم رکاب آیا
تو خوش ہوا اپنے ہی نزدیک عشق میں عارف
ہمیں تو حال تیرا کچھ نظر خراب آیا

(۳۶)

رُخ پر داغ جو شب اس کے مقابل کھولا
تو نے کیوں عیب کو اپنے مہ کامل کھولا
میری صورت نے دیا ہے تجھے دھوکا پہلے
جان کر قیس جو یوں پردۂ محمِل کھولا
ہم سمجھتے تھے کہ روکے گا زباں کو اپنی
تو نے تو ہاتھ بھی اے حور شمائل کھولا
تھی دمِ نزع، یہ کس زلفِ گرہ گیر کی یاد
عقدۂ تارِ نفس ہم نے بہ مشکل کھولا
دیکھ کر سایۂ قاتل کو زمیں پر عارف
میں نے آغوش کو اپنے دمِ بسمل کھولا

(۳۷)

اے فلک تو نے کہیں غنچہ کہیں دل کھولا
پر ہمارا نہ کوئی عقدۂ مشکل کھولا
ایسے عیار پہ کیا دعویٰ خوں ہو جس نے
سر کے بالوں کو عزاداروں کے شامل کھولا
اب تک اس راز سے تیرے نہ کوئی واقف تھا
آپ تو نے مجھے پہنا کے سلاسل کھولا
تھا اگر ذوقِ تماشائے شکارِ ماہی
کیوں نہ زلفوں کو خود اپنی لبِ ساحل کھولا
میں یہ حیراں ہوں کہ اُس دیدۂ تر نے عارف
میرے اس راز کو کیا دیکھ کے حاصل کھولا

(۳۸)

ہماری آہِ سوزاں نے، ہمارا خانماں پھونکا
جلایا گھر نہ دشمن کا نہ اک دن آسماں پھونکا
نہ سرگرمِ فغاں ہونا تھا مشتِ خس میں اے بلبل
یہ تو نے آپ نادانی سے اپنا آشیاں کھولا
سرشکِ چشم و آہِ دل نے غارت کردیا عالم
ڈبوئی سب زمین اِس نے تو اُس نے آسماں کھولا
موئے پر بھی وہی اس سنگ دل کی بدگمانی ہے
ہماری چشمِ (پُر) واماندہ کو بہرِ امتحاں پھونکا

اُڑا اٹھتا ہے توسن کر تو کچھ اب بات عارف کی — تیرے کانوں میں کیا دشمن نے اے نامہرباں پھونکا

(۳۹)

میں نے دیکھا کہیں گلخن تو نہ گلخن سمجھا — عاشقِ سوختہ جاں، کا اسے مدفن سمجھا
یہ تو کعبہ میں پھنسا اور وہ بت خانے میں — نہ تو کچھ شیخ ہی سمجھا نہ برہمن سمجھا
خاک سے میری وہ بجلی کوئی نکلی ہوگی — تو جیسے شمع میری قبر پہ روشن سمجھا
نہ گیا جانبِ صحرائے جنوں وحشت میں — اپنے کاشانہ ویراں ہی کو میں بن سمجھا
ایک عالم ہے، زبس در پے غارت، میرے — دشت میں خضر کو بھی دیکھ کے رہزن سمجھا
شب کو کیا محو تیرے گھر کے تصور میں ہوا — چشمِ حیراں کو ترے در کا میں روزن سمجھا
یہ بھی ہے طالع ناساز کی خوبی عارف (مقطع) جس کا میں دوست ہوا وہ مجھے دشمن سمجھا

(۴۰)

بازارِ عشق میں ہے ایک بے شمار سودا — لائیں ہیں جا کے واں سے ہم لاکھ بار سودا
دشتِ جنوں میں رہ کر وہ خار ہوں کہ مجھ سے — کرتی ہے تنگ وحشت رکھتا ہے عار سودا
آنکھوں کی ہے تمھاری آئینہ دار وحشت — زلفوں کا ہے تمھاری خدمت گزار سودا
پہلے ہی سے نہیں ہے یاں نقدِ ہوش باقی — ہم تجھ سے کیا خریدیں فصلِ بہار سودا
اس عہد میں نہ تھا میں رونق فزائے عالم — رکھتا نہ سب میں عارف کیوں ایک بار سودا

(۴۱)

وہ صدمہ ہے شکستِ دلِ نا اُمید کا — گرتا ہے ساتھ کنگرا عرشِ مجید کا
بس کھل چکا یہ قفل درِ عُقدۂ ہائے کار — دندانا گھس کے صاف ہوا جب کلید کا
زاہد کو دو نوید کہ فاقوں سے تنگ تھا — بن یار لطف کیا ہے ہمیں روزِ عید کا
قیمت میں اسکے بوسۂ لب کے لگا کے دل — سنتے ہیں تو بھی شور وہی مسنِ مزید کا
عارف روش وہ پختہ (کی) ہوگئی کہن — موجد ہوا ہوں اس لیے طرزِ جدید کا

(۴۲)

تھی بلاواسطہ سر کے میرے سامان کی جا — رنج اٹھاتا ہوں فلک میں بڑے احسان کی جا

غزل 38 کے چوتھے شعر میں ''واماندہ'' قیاسی تصحیح ہے۔

نگہ مت کیجو عبادت پہ کہ ڈر ہے زاہد
چھین لے وے کہیں کافر نہ مسلمان کی جا

کب گلوری ذہن تنگ میں لے سکتے ہیں
بات لاچار چبانے لگے وہ پان کی جا

پیراہن نور کا پہنے ہوئے ہے، وہ گویا
ایک مہِ نو نظر آتا ہے گریبان کی جا

سائے کا بھی نہیں یاں میرے ٹھکانہ عارف
کلبۂ تنگ میں کب ہے مرے مہمان کی جا

(۴۳)

مجھ کو دھوکا اپنے دل کا اے میری جاں ہوگیا
میں جو اتنا مائل سیبِ زنخداں ہوگیا

یہ مذمت ہے تری تجھ کو پری کہیے اگر
جس کو تو نے منہ لگایا وہ سلیماں ہوگیا

خون کے آنسو رُلایا مدتوں پھر چرخ نے
یہ تو اب زخم جگر کا ہے جو خنداں ہوگیا

غنچۂ وحشت پہ غالب دیدۂ تر ہی رہا
تار اشکوں کا میرے تارِ گریباں ہوگیا

عارضِ گل رنگ پر تو نے جو زلفیں چھوڑ دیں
تختۂ گلزار خو بھی سنبلستاں ہوگیا

بے خطر ہو گر خدا سے ہم پہ کرتا ہے ستم
اس قدر اب حسن پر تو اپنے نازاں ہوگیا

گل کے بدلے واں چڑھاویں گے ہم اپنے داغِ دل
گر گزر عارف سوئے گورِ غریباں ہوگیا

(۴۴)

مت پھرا دنیا میں پانی جب میں گریاں ہوگیا
ابرِ مژگاں غیرتِ ابرِ بہاراں ہوگیا

بچ گیا میرے خدنگِ آہ سے شب کو فلک
سامنے آکر سپر جو ماہِ تاباں ہوگیا

ساتھ تن کے اس قدر کاہیدہ ہر شے ہوگئی
آتشیں نالہ، چراغِ زیرِ داماں ہوگیا

مرگیا دیوانہ، گیسوئے معنبر کا تیرے
خانۂ زنجیر صد افسوس ویراں ہوگیا

فائدہ پچھتانے سے ہوتا تھا جو کچھ ہو چکا
دل اُسے دینا تھا عارف تو ہی ناداں ہوگیا

(۴۵)

اس زور سے کھینچا کہ لہو پر سے نکالا
خط لینے میں کیا باز کبوتر سے نکالا

احسان یہ ان (کا) ہے میرے سر پہ کہ میرا
تابوت میرے گھر کے برابر سے نکالا

یوں تو نہ بنی، اپنی کبھی سیم تنوں سے
ہر کام کبھی زور سے یا زر سے نکالا

زاہد جو گیا بوسۂ لب سے تیرے محروم
ارمان وہ اپنا لبِ کوثر سے نکالا

میں شرمِ معاصی سے گڑا جاتا ہوں عارف
کیوں منہ کو میرے، قبر میں چادر سے نکالا

(۴۶)

غم ہے گر چیں بر جبیں وہ گلبدن ہو جائے گا
صفحۂ سیمائے سیمیں، پر شکن ہو جائے گا

ہم نہ ہوویں گے کبھو عریاں جنونِ عشق میں
موئے سر یاں یاں بڑھ کے (خود ہی) پیرہن ہو جائیگا

دل اگر خوں ہو نہ ہو اس کے خیالِ زلف میں
یعنی جم کر نافۂ مشکِ ختن ہو جائے گا

لب تو لب تم خندقِ پا کو بھی دکھلا دو اگر
خوں (ا) سی کو دیکھ کر لعلِ چمن ہو جائے گا

مرتبہ روزِ قیامت میں پھر اپنی دیکھیو
تو اگر عارفؔ فدائے پنج تن ہو جائے گا

(۴۷)

سنبلستاں میں جو کہوے کوئی طوبا دکھلا
چھوڑ کر زلف کو تو قامتِ رعنا دکھلا

وہ جو ہیں معجزۂ شقِ قمر کے منکر
کھینچ کر اپنی جبیں پر انھیں قشقا دکھلا

اس کی آنکھوں کے تو بیمار ہیں ہم سے لاکھوں
کون عاشق ہے ترا نرگسِ شہلا دکھلا

پہلے ہم طاقتِ نظارہ تو پیدا کرلیں
کون کہتا ہے کہ اپنا رخِ زیبا دکھلا

کچھ نہیں عارفؔ گم گشتہ کی مدت سے خبر
یا رب اب کے تو ہمیں تو اسے زندہ دکھلا

(۴۸)

کیا کرے گی یہ تیری کاکل پیچاں، میرا
حال کچھ اس سے بھی افزوں ہے پریشاں میرا

پاس آنے بھی نہ دیوے کبھو پروانے کو
دیکھ لے حال اگر شمعِ فروزاں میرا

جی میں ہے دیکھیے مر کر بھی کہ کیا ہوتا ہے
جیتے جی تک تو نہ نکلا کوئی ارماں میرا

شکر صد شکر کہ تم آئے ہو میرے گھر میں
آج آباد ہوا خانۂ ویراں میرا

رخِ جاناں کا جو رہتا ہے تصور عارفؔ
کوکبِ بخت ہے یہ دیدۂ حیراں میرا

(۴۹)

میں چھپ کے شب جو کہیں کوئے فتنہ گر میں رہا
کوئی نہ دیکھ لے ہر دم اسی خطر میں رہا

دل و جگر سے جدا ہووے ہاتھ کیا تجھ بن
جو ہوک دل میں رہی درد بھی جگر میں رہا

میں دیکھ کر اُسے بیہوش ہو گیا لیکن
تصور اس کا سراپا میری نظر میں رہا

میں خاک ہو کے اُڑا جب مجھے ملا رتبہ
ہمیشہ سُرمہ کی جا دیدۂ قمر میں رہا

کبھو نہ آہ کا، لوں نام عمر بھر عارفؔ
رقیب آج اگر شب کو اس کے گھر میں رہا

(۵۰)

وہ جھوٹا ہے اُسے شیدا بنایا | کہ عالم میں جسے رسوا بنایا
ضرر اور نفع سے واقف نہیں ہیں | جہاں میں ہم نے کیا کھویا نہ پایا
دہانِ زخم دل بھی غم میں تیرے | کبھی اے گلبدن ہنستا نہ پایا
گیا دل اس طرح عشقِ بتاں میں | کہ اس کو پھر کہیں ڈھونڈا نہ پایا
رسولِ ہاشمی ظلِ خدا ہے | کہ سائے کا کہیں سایہ نہ پایا
لحد تک بدگمانی لائی اس کو | جنازہ کو میرے چھوڑا نہ پایا
ہوا کیا حال عارفؔ کا کہ اب کے | ترے در پہ اُسے تنہا نہ پایا

(۵۱)

ہو کسی طور سے وہ کافرِ بدخو اپنا | اثر اے نالۂ دل کچھ تو دکھا تو اپنا
دردِ آہِ دلِ مجنوں کا اثر تھا وہ بھی | آپ لیلیٰ نہ سیاہ کرتی تھی نینو اپنا
ہم کو خورشید میں ہوتا ہے مہِ نو کا گماں | تم بھی دیکھو کبھو آئینہ میں ابرو اپنا
شبِ فرقت میں دل امڈا ہی چلا آتا ہے | طرفۃ العین بھی تھمتا نہیں آنسو اپنا
اختیاری نہیں رونا یہ ہمارا عارفؔ | آہ آنکھوں میں بھی جلتا نہیں فانو اپنا

(۵۲)

نہ پردہ کھولیو اے عشق غم میں تو میرا | کہیں نہ سامنے ان کے ہو زرد رو میرا
تم اپنی زلف سے پوچھو میری پریشانی | کہ حال اس کو ہے معلوم ہو بہو میرا
اگرچہ لاکھ رفوگر نے دل کیا بہتر | یہ جب بھی ہو نہ سکا زخم دل رفو میرا
فقط وہ اس لیے آتے ہیں جانبِ زنداں | کہ پھنس کے گھٹنے لگے طوق میں گلو میرا
نشانہ تیرِ نگہ کا یہ دل کروں عارفؔ | لڑائے آنکھ اگر مجھ سے، جنگجو میرا

غزل (۵۱) کے شعر تین میں ''نینو'' کا لفظ آیا ہے۔ اُس زمانے میں جو کپڑے رائج تھے ان میں ایک نینو بھی تھا اس کا ذکر حالیؔ کے یہاں غالبؔ کے ملبوس کے ذیل میں آیا ہے۔ چوتھے شعر میں 'طرفۃ العین' کی عربی اصطلاح آئی ہے۔ اس طرح کے الفاظ عارفؔ کے ہاں زیادہ تو نہیں مگر کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ مقطعے میں عارفؔ نے فانوس کی جگہ 'فانو' استعمال کیا ہے، یہ ایک نئی بات ہے۔ جو کہیں اور مشکل ہی سے دیکھنے کو مل سکتی ہے۔

(۵۳)

تیرے دہن کو کہتے ہیں کوزہ نبات کا
ہوتا عجب ہے پھر نمکیں، تیری بات کا

تیرے لبوں پہ کس لیے مرتا ہے پھر جہاں
گر اصل میں یہ چشمہ ہے آبِ حیات کا

اے ہم صفیر خاک بناتا ہے آشیاں
کیا اعتبار اس چمنِ بے ثبات کا

لکھتا ہوں نامہ خامۂ مژگاں سے یار کو
لیتا ہوں کام دیدۂ تر سے دوات کا

عارفؔ زباں پہ ورد رہے نامِ مصطفیٰ
اس کے سوا وسیلہ نہیں ہے نجات کا

(۵۴)

جسمِ لاغر بوجھ سے پس جائے اس رنجور کا
سایہ پڑ جاوے اگر مژگانِ چشمِ مور کا

کیوں نقابِ رُخ اٹھا کر تم چلے آتے نہیں
عذریاں آنے میں ناحق ہے شبِ دیجور کا

خون میرا کس لیے لیتے ہو اپنے سر پہ تم
بوجھ کو سر پر اٹھانا شیوہ ہے مزدور کا

ابرِ تر سے حشر تک چنگاریاں برسا کریں
ہو، اگر اس میں اثر میرے تنِ محرور کا

کیا دلِ پُرغم یہ میرا، لے کے عارفؔ ہو سرور
آشیانِ باز میں کب دخل ہے عصفور کا

(۵۵)

ذکر میں کیونکر کروں پر اس کے آگے حور کا
یاد ہے چیں بر جبیں ہونا، بُتِ مغرور کا

ہر رگ و پے میں بھلا اتنا تو ہووے گا اثر
قطرہ جو ٹپکے عرق کا دانہ ہو انگور کا

حرفِ حق میں چھوڑ کر یوں بولتا کا ہے کو جھوٹ
حال پہلے سے نہ سن لیتا اگر منصور کا

نامۂ اعمال میرا واں جو کھولا ناگہاں
تھا گماں روزِ قیامت پر شبِ دیجور کا

ساتھ دل کے زخم بھر جاتے ہیں عارفؔ سب کے سب
میرے رونے میں اثر ہے مرہمِ کافور کا

(۵۶)

ناتوانی میں پلک کو بھی ہلایا نہ گیا
دیکھ کے ان کو اشارے سے بلایا نہ گیا

سنگ سخت تر سنگ سے بھی دل ہے انھوں کا شاید
نقش جس پر کسی عنوان بٹھایا نہ گیا

گلشن خلد میں ہر چند کہ دل بہلایا
کوچۂ یار مگر دل سے بھلایا نہ گیا

شکنِ زلف سے دل صاف نظر آتا ہے
اس اندھیرے میں تعجب ہے چھپایا نہ گیا

دیکھ کر کل وہ میرا حالِ پریشاں عارفؔ
ایسا گھبرائے کہ آنکھوں کو چرایا نہ گیا

(۵۷)

دیکھ کر کیا نہ وہ روتے پہ رُلایا نہ گیا
زخمِ دل کھول کر ہم سے بھی دکھایا نہ گیا

عشق میں حلق سے کچھ اور اترتا ہی نہیں
عمر بھر غم کے سوا زہر بھی کھایا نہ گیا

حیف اے آتشِ دوزخ کہ میرا دامنِ تر
دیکھتا ہوں تو ذرا مجھ سے دکھایا نہ گیا

اس میں تھا حال جو گریہ کا ہمارے مرقوم
ان سے وہ نامہ کسی طرح جلایا نہ گیا

محفلِ یار میں پھر رونے سے حاصل عارف
سامنے غیر کے جب اشک بہایا نہ گیا

(۵۸)

گو سُن کے تیرے ذکر کو بے ہوش ہوگیا
پر اشتیاق میں ہمہ تن گوش ہوگیا

نکلا ہے، سبزہ اس کی ذقن پر غضب ہوا
اس چاہ سے خطر ہے جو خس پوش ہوگیا

کیونکر کہوں کہ جانے سے غم کے نہیں ہے غم
ویران میرا گوشۂ آغوش ہوگیا

ناواقفوں کے سامنے بکتا تھا جھوٹ موٹ
دشمن وہ ہم کو دیکھ کے خاموش ہوگیا

عارف بتوں سے اس کو محبت اگر نہ تھی
کیوں کعبہ اُن کے غم میں سیاہ پوش ہوگیا

(۵۹)

پاؤں میں اس نے جو مہندی کا لگانا چھوڑا
خونِ دل ہم نے بھی آنکھوں سے بہانا چھوڑا

کیوں درِ میکدہ سے اٹھ کے ہوا خضر کے ساتھ
ایک مدت کا عبث میں نے ٹھکانا چھوڑا

آنکھ لگ جائے کسی وقت تیرے دربان کی
میں نے اس واسطے یاں شور مچانا چھوڑا

آگے آگے جو تیرے، غیر کو چلتے دیکھا
ہم نے آنکھوں کو تری رہ میں بچھانا چھوڑا

کون کافر اسے آیا ہے سمجھ کے جنت
یہ گماں ہو تو ترے کوچے میں آنا چھوڑا

بن بلائے تو خدا پاس نہ جاوے کوئی
کون آتا ہے اگر تو نے بلانا چھوڑا

مدت العمر کہی اپنی کہانی عارف
تو نے زنہار نہ یاروں کو رُلانا چھوڑا

غزل (۵۹) کے چھٹے شعر میں 'خدا پاس' استعمال ہوا ہے غالب کے زمانے تک بعض الفاظ کی ترکیب دہی کے وقت کا، کی، کے حروف چھوڑ دیے جاتے تھے مثلاً غالب نے خود 'بھنو پاس' لکھا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں ابرو کے پاس یہی صورت یہاں عارف کے یہاں بھی ملتی ہے یہ غالب کا برائے راست تو کوئی اثر نہیں ہے اُس دور کی زبان کا اثر ہے جو غالب نے بھی قبول کیا اور عارف نے بھی۔

(۶۰)

شیخِ حرم کو جس نے برہمن بنالیا
اُس بُت کے در پہ ہم نے بھی مسکن بنالیا

افسوس ضبطِ رازِ محبت نہ ہوسکا
میری زباں نے دوست کو دشمن بنالیا

عارض کا تیرے اس دلِ سوزاں میں ہے خیال
گلخن میں سحر عشق سے گلشن بنالیا

ہیں ہم سفیر پستیِ ہمت پہ طعنہ زن
طوبیٰ پہ میں نے جب سے نشیمن بنالیا

عارفؔ ترے درِ سخنِ آبدار سے
سامع نے اپنے کان کو معدن بنالیا

(۶۱)

ہر چند کہ اب مجھ سے ستم اٹھ نہیں سکتا
لیکن تیرے کوچے سے قدم اٹھ نہیں سکتا

کیا ضعف نے، شرمندہ کیا، صبر کے آگے
فرقت میں جو یہ بارِ الم اٹھ نہیں سکتا

جو کعبہ میں ہے، ہے وہی بت خانے میں جلوہ
اک پردہ ہے سو شیخِ حرم اٹھ نہیں سکتا

تو ہووے خفا اور نہ در سے ترے اُٹھوں
سر ہی ترے قدموں کی قسم اٹھ نہیں سکتا

عالم میں لُٹائی ہے بڑی حسن کی دولت
میری ہی طرف دستِ کرم اٹھ نہیں سکتا

گو ہیچ تو ہے کوچۂ دلدار میں یارب
اٹھا تو قدم سوئے ارم اٹھ نہیں سکتا

عارفؔ کو جو دیکھا ہے تو چلنے میں ہوا ہے
لیکن ترے کوچے سے قدم اٹھ نہیں سکتا

(۶۲)

یہ تو ہے، خُلد میں، کیا کچھ نہیں، رضواں پیدا
کچھ نہیں ہے، جو نہ ہو، کوچۂ جاناں پیدا

کر سکے کون مُسخّر تجھے اے رشکِ پری
پھر سے دنیا میں کہاں سے ہو سلیماں پیدا

نہ ملا خاک میں لاکھوں گو ہر اشک میرے
مجھ کو پھر ہیں یہ کہاں دیدۂ گریاں پیدا

اُستخواں ان سے نظر آنے لگے ہیں اب تو
دہنِ زخمِ جگر میں ہوئے دنداں پیدا

لبِ شیریں کا ترے وصف جو لکھوں اس میں
میرے دیوان میں ہو چشمۂ حیواں پیدا

پرتو افگن ہو تمھارا رخِ روشن جس جا
واں سے ہو ذرہ کی جا مہرِ درخشاں پیدا

لامکاں تک نظر آوے مجھے پھر تو عارفؔ
ہووے گر خاکِ درِ شاہِ خراساں پیدا

غزل (۶۲) کے مقطعے میں ''شاہِ خراساں'' حضرت علی کو کہا گیا ہے۔

(۶۳)

ہاں میکشی کو سب سے چھپانا ضرور تھا
پہلے مگر کہاں مرے چہرے پہ نور تھا

اپنا ہی ظرف ہے یہ کہ پی کر خُم شراب
دل میں جو غور کی، تو لہو میں سرور تھا

کیوں جان ودل کو چھوڑ کے ایماں ہی اک لیا
تھا جو کہ اپنے پاس وہ ترے حضور تھا

وہ بھی نہ سوئے بس کہ لرزتی رہی زمیں
کل شب جو لوٹتا یہ دلِ ناصبور تھا

عارفؔ ہزار سجدۂ بُت، جھک کے کیجیے
پہلے مگر کہاں مرے چہرے پہ نور تھا

(۶۴)

(ردیف: ب)

دل لگا کر بسکہ رہتے ہیں پشیماں روز وشب
پشتِ دستِ عاشقاں ہے، وقفِ دنداں روز وشب

معنیٔ روشن نکالے کس طرح حرفوں سے تو
جب ممیّز ہو سکے تجھ سے نہ ناداں روز وشب

رات کو کہتے ہیں سب ہے پردہ پوشِ عاشقاں
عشق میں رسوا رہے ہیں ہم تو یکساں روز وشب

سر سے ہاتھوں کو نہیں فرصت ہے اب تو ایک دم
چاک کرتے تھے کبھی ہم بھی گریباں روز وشب

بلبلِ باغِ معانی کیوں نہ ہو عارف نظر
دیکھتے ہیں حضرتِ غالب کا دیوان روز وشب

(۶۵)

زاہد کو ان بتوں سے ہے انکار بے سبب
صورت سے آدمی کی ہیں بے زار بے سبب

حصے کی نیند میری بھی لی میرے بخت نے
رہتا نہیں ہمیشہ میں بیدار بے سبب

اُن پر ہوا ہے یہ، نظرِ بد کا کچھ خلل
آنکھیں نہیں ہیں آپ کی بیمار بے سبب

ہیں جاں سے تنگ کوچہ قاتل کو جائیں گے
واں روز قتل ہوتے ہیں دو چار بے سبب

کچھ چھوٹ دل پہ ان کے بھی عارفؔ ہے جان سے
ہر دم نہیں، وہ پڑھتے ہیں اشعار بے سبب

غزل (۶۴) کے مقطعے میں عارفؔ نے یہ کہا ہے کہ غالب کا دیوان روز وشب ان کے پیش نظر رہتا ہے۔ ان کے اس بیان سے انکار کی جرأت تو نہیں کی جاسکتی لیکن اس کا کوئی اثر عارفؔ کی شاعری پر مرتب ہوا ہو اس کے بارے میں ایک سوالیہ نشان ضرور قائم ہوتا ہے کہ انھوں نے غالبؔ کی زمینیں بھی بہت کم اختیار کی ہیں۔ غالبؔ کے یہاں آنے والی لفظی تراکیب کا ان کے دیوان میں کوئی اثر ونفوذ نہیں ملتا اور اگر ملتا بھی ہے تو برائے نام یا خال خال، اس لیے اس طرح کے اشعار کی وقتی تاثر کی طرف تو اشارہ کرتے ہیں لیکن تقلید غالب کی طرف نہیں۔

(۶۶)

وہ تو از روئے تکبر کچھ نہیں دیتا جواب
شاد ہوتا ہوں سمجھ کر بات اپنی لاجواب

اب تلک آئینہ شاید آپ نے دیکھا نہیں
آپ جو کہتے ہیں ہم رکھتے نہیں اپنا جواب

میں تو مرجاتا وہیں غیرت سے کوہِ طور پر
اس طرح سے صاف گر ملتا مجھے موسیٰ جواب

بات اس نے کون سی مجھ سے کہی ہے بزم میں
چاہتا ہے مثلِ قلقل مجھ سے جو مینا جواب

آتش و ناسخ کا سمجھا ہے کہیں یہ بھی کلام
لکھ سکے عارفؔ غزل کا میری کوئی کیا جواب

(۶۷)

ردیف: پ

یاں چلا آئے جو وہ سیم بدن آپ سے آپ
دفع ہو دل سے میرے رنج و محن آپ سے آپ

مت رہو چیں بہ جبیں (اس سے) کہ کوئی دن میں
اس سے بے ساختہ وہ دے گی شکن آپ سے آپ

کل اُسے دیکھ کے بھر آئی جو چھاتی میری
بھر گئے سینے کے سب زخمِ کہن آپ سے آپ

اس کے رخسار کو کب دل سے بھلایا ہم نے
رک گیا ہم سے وہ کچھ رشکِ چمن آپ سے آپ

اثرِ جذب (جو) غربت میں دکھاؤں عارفؔ
آ کے موجود ہو وہ ملکِ وطن آپ سے آپ

(۶۸)

گل، میں کھا کھا کے ہوا رشکِ چمن آپ سے آپ
ہوگئی کیا میری آرائشِ تن آپ سے آپ

چرخ تک جا کے نہ بدنام ہو، اے نالۂ دل
بیٹھ جانے کو ہے یہ سقفِ کہن آپ سے آپ

اس میں کیا چشمۂ حیواں کی ہیں سوتیں جاری
کیا اُبلتا ہے تیرا چاہِ ذقن آپ سے آپ

ہم نے حیران کیا ہے اسے بوسہ لے کر
کیا ہوا ہے یہ میرا تنگ دہن آپ سے آپ

کیا کریں جب کہ بجا دل ہی نہ ہووے عارفؔ
چھوٹ جاوے گا بس اب فکرِ سخن آپ سے آپ

(۶۹)

ردیف: ت

رخ پر رہی وہ زلفِ معنبر تمام رات
روشن نہ وصل میں ہوا (یہ) گھر تمام رات

دیکھا تو غور سے ترے بیمار کو نہیں
اُس پر پڑی رہی ہے یہ چادر تمام رات

دل کو بھی (جیسے) بھول گیا بے خودی میں کچھ
ڈھونڈا کیا میں کل جو تیرا گھر تمام رات

ہووے گا قتل صبح کو کوئی جو سخت جاں
کرتے رہے ہیں تیز وہ خنجر تمام رات
عارفؔ نہیں ہے ہم کو صبوحی کی احتیاط
لیتے ہیں نامِ ساقیٔ کوثر تمام رات

(۷۰)

کیسا رہا میں اپنے پہ نازاں تمام رات
گھر میں رہا جو وہ میرے مہماں تمام رات
اک دم اُلٹ تو (دو) رخِ روشن سے تم نقاب
بولا کریں گے مرغِ گلستاں تمام رات
بالی میں میری آن کے رہتی ہے کس کو تاب
روتی رہی ہے شمعِ شبستاں تمام رات
گر موت بھی نہ آوے تو کیا کیجیے ہجر میں
کرتا رہا میں مرنے کا ساماں تمام رات
عارفؔ غمِ فراق میں روتا رہا میں کل
آنکھوں پہ رکھ کے گوشۂ داماں تمام رات

(۷۱)

جنبش نہیں مژہ کو وہ ہے انتظارِ دوست
کیونکر چنوں میں خار و خس رہ گزارِ دوست
حیراں ہوں میں کہ جیتے ہیں کیونکر فراق میں
عاشق ہیں خاک جن کو رہے انتظارِ دوست
دیکھوں بھلا 'نقی' کو تیری پیرِ خانقاہ
ہو جائے اس طرف کو کسی دن گزارِ دوست
اے موت تیرے واسطے لاویں کہاں سے اور
رکھتے تھے ایک جان سو کر دی نثارِ دوست
عارفؔ عجیب اب تو زمانے کا حال ہے
دشمن تو کیا کہ ہم کو نہیں اعتبارِ دوست

(۷۲)

دے پاؤں وہ ہمیں جو کریں جستجوئے دوست
دے وہ زباں خدا کہ کریں گفتگوئے دوست
اُس دن نصیب ہووے کمالِ صفائے دل
دشمن سے جب کہ آنے لگے تجھ کو بوئے دوست
ملتا ہے رہروانِ محبت کا کب سراغ
پلکوں سے کی ہے ہم نے سدا جستجوئے دوست
روح القدس بھی آ کے جو تجھ سے ہو ہم کلام
اس سے بھی کیجیو نہ بجز گفتگوئے دوست
زلفوں پہ دل گیا تو پڑھو دل کی خاتمہ
عارفؔ بھلا ہے حلقۂ پیاکِ موئے دوست

(۷۳)

ردیف: ث

یہ غم نہیں کہ نہ سر پر کوئی رہا وارث
جنھوں کا کوئی نہیں ان کا ہے خدا وارث
سمجھ کے اس کو اٹھا تا اڑا دے ایک دم میں
متاعِ خاک کی تو ہے میری صبا وارث
سنبھال لیجو میرے بعد وحشتِ مجنوں
یہ ترکہ وہ نہیں جس کے ہوں اقربا وارث

کسی کو مال بھی ہم غمزدوں کا راس نہیں
کہ بعد مرے مرے گھر کی ہے بلا وارث

ذرا بھی عالم غربت میں غم نہ کھا عارف
جنھوں کا کوئی نہیں ان کا ہے خدا وارث

(۷۴)

ردیف: ج

اور الٹا ہو تجھے جب میری تقریر سے رنج
کھوویں پھر دل سے تیرے کون سی تدبیر سے رنج

اس میں مضموں تو نہ تھا کوئی شکایت آمیز
کیوں ہوا ان کو میرے نامے کی تحریر سے رنج

کوئی ہو اس کو گلے اپنے لگا لینے، میں
نہ تو خنجر سے کدورت ہے نہ شمشیر سے رنج

متفق میں نے نہ پایا کبھی ان کو ہرگز
کیا ازل سے ہے مری آہ کو تاثیر سے رنج

رنج میں کوئی بھی یوں دل میں گرہ دیتا ہے
یہ کہا کس نے کہ ہے ہم کو تیرے تیر سے رنج

کوئی تو پاس رہے عالم تنہائی میں
کس لیے (کسطرح) دور کریں ہم دل دلگیر سے رنج

سونے دیتا نہیں درباں کو یہ اس کے عارف
کیوں نہ ہو اپنے مجھے نالہ شب گیر سے رنج

(۷۵)

نہ گلا تجھ سے نہ کچھ ہے فلک پیر سے رنج
جو پہنچتا ہے سو مجھ کو میری تقدیر سے رنج

ہوگئی اس سے سوا موت کی جلدی سے خوشی
جس قدر ہم کو ہوا تھا تیری تاخیر سے رنج

شب کو گھبرا کے وہ الٹے گئے اغیار کے گھر
ان کو کیا مجھ کو ہوا آہ کی تاثیر سے رنج

ہم سے ہر روز الجھتا جو یہی ہے اس کا
ہو کے رہ وے گا تیری زلف گرہ گیر سے رنج

سرخ رو ہم کو رکھا بے اثری نے عارف
اس کو پہنچا نہ کبھی نالہ شب گیر سے رنج

(۷۶)

چھڑکاؤ کردے دیدۂ تر میرے گھر میں آج
آنے کی ہے یہاں دل رشکِ قمر میں آج

صیدی میرا الٰہی نہ ہو اپنے گھر میں آج
باندھا ہے میں نے نامہ کبوتر کے پر میں آج

دیکھا ہے صبح اس نے بھی عارض جو یار کا
جچتا نہیں ہے مہر بھی اپنی نظر میں آج

پھرتا ہے کیا یہ خنجر قاتل کو ڈھونڈتا
دوران ہو رہا ہے بہت میرے سر میں آج

عارف نہ کہہ رہا میں نہ وہ رنگِ زرد میں
تاثیرِ جذب بخشی ہے جو حق نے زر میں آج

(۷۷)

یارب کروں میں دیدہ گریاں کا کیا علاج
خود ہو سکا تھا نوح سے طوفاں کا کیا علاج

مانا کہ روزِ وصل میں شاداں ہوئے ہیں ہم — پر ہے تباہیِ غمِ ہجراں کا کیا علاج
کب انتظار اس بُتِ پیماں شکن کا ہے — اے ہم نشیں یہ دیدۂ گریاں کا کیا علاج
گو زخم ہائے تن میرے بھر آئے چارہ گر — اے بے خبر جراحت پنہاں کا کیا علاج
لاؤں بچا کے واں سے گریباں کو کس طرح — عارفؔ درازدستیِ درباں کا کیا علاج

(۷۸)

ردیف: چ

تو نہ یوں اپنے کو ہم سے اے بتِ اغیار (عیّار) کھینچ — ایک دن لاوے گا میرا جذبِ دل ایک بار کھینچ
قتل کرنے میں میرے اتنا تردّد کس لیے — میں جھکا دوں سر کو اپنے تو ذرا تلوار کھینچ
مت لگا تیرِ نگہ میرے دلِ وحشی پہ تو — ڈال کر اس پر کمندِ طرّہ خمدار کھینچ
دیکھ کر یارانِ محفل سب کہیں گے بے تمیز — ساغرِ ے ایک دم مت اے بتِ میخوار کھینچ
ہے اگر ماتھے پہ عارفؔ سجدہ بُت کا نشاں — ایک قشقہ بھی جبیں پر باندھ کر زنار کھینچ

(۷۹)

ردیف: ح

ہے عام سب کو بہر صبوحی صلائے صبح — پر ظرف ہی نہ ہو تو تجھے کیا بُلائے صبح
رخ سے اٹھائے وہ نہ شبِ وصل میں نقاب — ڈرتا ہوں میں ابھی (سے) کہیں ہو نہ جائے صبح
فوجِ نجوم تابِ اقامت نہ لا سکی — جس دم فضائے چرخ پہ چمکا لوائے صبح
رہوے نہ پھر کسی کو شب و روز میں تمیز — بے درد گر نہ ہوویں میرے نالہ ہائے صبح
نسبت ہے اس کو ہر دلِ روشن دلاں سے کیا — ہر چند دل کشا ہے نہایت فضائے صبح
مختار ہے سفید کرے یا صبح کرے — مت پوچھ حالِ شام نہ کچھ ماجرائے صبح
عارفؔ شراب بہرِ صبوحی نہیں نصیب — مقبول ہو کہاں یہ ہماری دعائے صبح

(۸۰)

ردیف: خ

میرے ہی قتل پہ کیا ہے وہ پُر جفا گستاخ — نہ رہوے قافلہ بولے اگر ذرا گستاخ
پڑی ہے خاک خدا جانے اس میں کس کس کی — نہ چلیو کوچۂ جاناں میں اے صبا گستاخ
یہ سر وہ ہے کہ درِ یار کی ہے خاک اس پر — نہ ہو تو سایہ فگن ہو کے اے ہما گستاخ

وہ چُست ہے کہ تجھے کردیا ہے تنگ اس نے
نہیں ہے کم مری آغوش قبا گستاخ
ادب سے مانگ اگر مانگنا ہے بوسۂ لب
سوال کرنے میں عارفؔ کہیں گدا گستاخ

(۸۱)

ہو نہ جس کا لب ترے لب کے برابر یار سرخ
سُرخی یاں سے کرے کیونکر نہ وہ لاچار سُرخ
خون ہوتا ہے اگر دنیا میں سب کا ہی سفید
کیوں لہو سے میرے ہوتی ہے تری تلوار سُرخ
سچ ہے بوسوں کا نہیں ہے غیر کو دعویٰ غلط
آج سب دن کے سوا ہیں آپ کے رخسار سُرخ
خون آنکھوں میں اُتر آیا ہے کس کو دیکھ کر
ہو گئیں آنکھیں جو میری اے بتِ خونخوار سُرخ
داغ خونِ عاشقاں دامن پہ تا ظاہر نہ ہو
اس لیے پہنے ہے جوڑا وہ بتِ عیار سُرخ
تشنہ خونِ عاشقاں کی تھی یہ خنجر سے سوا
ہو گئی آخر زمیں کوچۂ دلدار سُرخ
عارفؔ دیوانہ ٹکراتا ہے شاید (اپنا سر)
بے سبب ہرگز نہیں ہے یہ تری دیوار سُرخ

(۸۲)

ردیف: د

کیونکر ہو تیرے لب کے برابر ہلالِ عید
برسائے اس طرح سے تو شکر ہلالِ عید
رہتی ہے بسکہ قتل کی اپنی خوشی مجھے
قاتل کا میرے حق میں ہے خنجر ہلالِ عید
زاہد کی طرح کب رمضاں کا ہوں معتقد
میں شاد ہوؤں دیکھ کے کیونکر ہلالِ عید
کب صبر ہے کہ دیکھ کے واں گھر سے جایئے
دیکھیں گے مے فروش کہ در پر ہلالِ عید
عارف مسرت آج کی سنت ہے شاد ہو
خوش دیکھ کر ہوئے تھے پیمبر ہلالِ عید

(۸۳)

کھلتا ہے جب نقابِ رخ کے وہ دلدار بند
خیرگی سے چشم ہو جاتی ہے تب یکبار بند
شہر میں غارت گری کی ان کی جب سے دھوم ہے
ہو گئی ہے تب سے راہِ رُہزن و بازار بند
گر کبھی منظور ہو تجھ کو جو اس عالم کی سیر
آنکھ کر لے اس طرف سے ہے اگر ہشیار بند
کم نہیں طوفان سے موجِ سرشکِ چشمِ تر
باندھ سکتا ہے (بھلا) اس کا کوئی معمار بند
سیر کو آیا ہے عارفؔ وہ میرا یوسف کہیں
ہے ہجومِ خلق سے جو رستہ و بازار بند

(۸۴)

کرتا برسا کے گہر وادی و کہسار سفید
کوچۂ یار کو کر چشم گوہر یار سفید

خونِ عشاق کی تہمت ہے سراسر اس پر | ہاتھ میں اُس کے نظر آتی ہے تلوار سفید
لبِ دنداں کو ترے ان سے نہ کیوں دیں نسبت | سرخ یاقوت ہے اور گوہرِ شہوار سفید
شہر میں رو(نے) سے میرے وہ جمی ہے کاہی | حشر تک ہوں گے نہ ہرگز در و دیوار سفید
عکس (مے) سے نظر آتا ہے گلابی عارف | ورنہ ہوتا ہے سدا پیرہنِ یار سفید

(۸۵)

اثر گریہ نمودار ہوا مرے بعد | کوئے جاناں میں اوگی (اُگی) مہر گیا مرے بعد
اپنی آنکھوں سے بھلا کون کرے گا چھاویں | کون دھووے گا تری یوں کفِ پا مرے بعد
جس قدر جور کے ارماں ہیں وہ ہم پر کرلے | ہاتھ سے تیرے ہے پھر کس کی قضا مرے بعد
ہم ہی تھے ایک مخل شب کو تیری محفل میں | سب وہ معلوم ہے جو کچھ کہ ہوا مرے بعد
مجھ سے جاں باز کہاں ہوتے ہیں صاحب پیدا | لاکھ دکھلایئے انداز و ادا مرے بعد
اب جو پھنستا نہیں پھندے میں کوئی طائرِ دل | پیچ کھاتی ہے پڑی زلفِ دوتا مرے بعد
کیا ہوا جان سے گر اپنی گیا میں عارف | رہ گیا دہر میں پر نامِ وفا مرے بعد

(۸۶)

کون سی بات ترے آگئی اے یار پسند | مجھ کو دنیا میں نہیں کوئی نظر دار پسند
ساغر ایک ہاتھ میں، ایک ہاتھ میں مینائے شراب | ہے یہ انداز ترا ساقیِ سرشار پسند
ان کو منظور یہ تھا اب سے نہیں (مدت سے) | دل کو کرتے جو (رہے) وہ میرے ہر بار پسند
گزرے کچھ حال کسی پر نہیں ہوتا ظاہر | مجھ سے غمگیں کو ہے کیوں اپنی شب تار پسند
بات میری نہ کبھو جس کو خوش آئی عارف | اس کو کیا خاک مری آئے گی اس بار پسند

(۸۷)

ردیف: ذ

نامہ کیا لکھتے تمھیں جب کہ اٹھایا کاغذ | موجۂ اشک نے اک بار بہایا کاغذ
اور تو کیا تری تصویر وہ ہوگی شاید | مہِ کنعاں نے جو آنکھوں سے لگایا کاغذ
تھا جہاں گریہ کا مضموں میرے دیواں میں لکھا | اس کی تاثیر نے اُس جا کا جلایا کاغذ
وصفِ عارض جو ترا تھا مجھے لکھنا منظور | عطرِ گل میں وہ کئی روز بسایا کاغذ
لکھ دیا تھا اُسے کب خطِ غلامی عارف | اس نے جعلی کوئی شاید کہ بنایا کاغذ

(۸۸)

جب گلے میں ترے بیمار کے ڈالا تعویذ
جل گیا سوزِ تپِ غم سے سراپا تعویذ

ہے بشر کو پسِ مردن بھی حفاظت منظور
حول کا ہے میرے مصداق لحد کا تعویذ

پہلے قسمت کا تو کر فکر مری اے عامل
مجھ کو ڈر ہے نہ کرے یوں اثر اُلٹا تعویذ

حضرتِ ساغر کے عمل کو وہ بھلا کیا جانے
بیٹھ کر کرتے ہیں مسجد میں جو گنڈا تعویذ

مرضِ عشق ہوا جب سے مجھے اے عارف
پھر ہے بیکار دوا اور ہے بے جا تعویذ

(۸۹)

ردیف: ر

کرنے لگا تھا ناز جو اُس رشکِ ماہ پر
پھولا ہوا تھا اپنی میں، ناچیز آہ پر

کافر گئے جحیم میں مومن بہشت میں
اب تک ہوں منتظر میں ترا، شاہراہ پر

حارج ہے بیچ میں یہ ترا ذوقِ انتظار
کی ہوتی جان ورنہ فدا تری راہ پر

وہ پُرغرور کاہے کو کرتا تھا پائمال
کن مشکلوں سے میں اسے لایا ہوں راہ پر

عارف لبوں پہ حضرتِ غالب کے دھیان ہے
اوروں کی شاد ہوتے نہیں واہ واہ پر

(۹۰)

باتیں جو تھیں نہ کرنے کی سب کچھ وہ ہم نے کیں
ظاہر کیا نہ اک غمِ پنہاں تمام عمر

سودائے زلف اے سرِ شوریدہ تو بھی کر
لاکھوں اٹھائے ہم نے نقصان تمام عمر

واں بھی ملا نہ یوسفِ دل کا مرے پتا
جھانکا کیا وہ چاہِ زنخداں تمام عمر

اے خضر ایک دن مرے گھر میں تو کر گزر
دیکھا نہ ہوگا ایسا بیاباں تمام عمر

پھونکا ہے لوگ کہتے ہیں عارف کی لعش کو
ہم تو سُنا کیے تھے مسلماں تمام عمر

(۹۱)

در پہ رہے یہ دیدۂ گریاں تمام عمر
لیکن بجھی نہ آتشِ ہجراں تمام عمر

ڈالا ہے اس کو جذبِ محبت نے چاہ میں
دیکھا نہ جس نے تھا کبھی زنداں تمام عمر

واقع میں یہ ہے حرفِ شکایت بھی کیا کہیں
نکلا نہ کوئی، جو برا ارماں تمام عمر

پامال کو بھی ہم نے کیا اپنا ہم جلیس
چھانا کیا (کیے) میں خاک بیاباں تمام عمر

راتوں کو میرے واسطے اٹھتا ہے بار بار
بھولوں گا دردِ دل کا نہ احساں تمام عمر

کیا مجھ کو اپنی یاد سے خلقت نے کھودیا — سمجھا کیا میں آپ کو انساں تمام عمر
عارفؔ لکھیں ہیں اس میں مضامینِ انتشار — ہووے گا جمع میرا نہ دیواں تمام عمر

(۹۲)

کوئی نہیں جذبِ دلِ شیدا کے برابر — پاس اُس کو بٹھایا ہے مرے لاکے برابر
تم کھول تو دو دستِ حنا بستہ کو اپنے — اک اس میں ہے پرتوِ یدِ بیضا کے برابر
صورت لبِ رنگیں کی ہے یہ سبزۂ خط سے — بیٹھے ہوں خضر جیسے مسیحا کے برابر
دن کو جو کیا وعدہ کبھی آنے کا اُس نے — زلفوں کو بڑھایا شبِ یلدا کے برابر
عارفؔ غزل اک اور سنا اس سے بھی بہتر — سب آج تجھے کہتے ہیں سودا کے برابر

(۹۳)

ہوں داغ سے میں لالۂ حمرا کے برابر — حیرت نے کیا نرگسِ شہلا کے برابر
شمشاد و صنوبر ہوئے گلشن میں ہزاروں — پہنچا نہ کوئی اس قدر رعنا کے برابر
کیا لوگ ہیں جو لعل ترے کہتے ہیں لب کو — پتھر کو سمجھتے ہیں مسیحا کے برابر
وحشت میں جو مر جاؤں تو یارب یہ دعا ہے — تُربت میں ہو وسعت میری صحرا کے برابر
بیتابیِ سیماب سنا کرتے تھے عارفؔ — دیکھا تو نہیں اس دلِ شیدا کے برابر

(۹۴)

فروغِ حسن سے عالم ہے وہ اُس شوخِ پُرفن پر — کہ زردی چھا گئی محفل میں روئے شمعِ روشن پر
بگولا روکشِ ابرِ بہاری ہے یہاں اگر — برستی ہے وہ ویرانی ترے مجنوں کے مسکن پر
کوئی ممکن ہے اس پردہ نشیں کا دیکھنا اے دل — خیالِ چشمِ نامحرم جسے ہو چشمِ سوزن پر
ہوئی ہے مانعِ صحرا نوردی شرطِ عریانی — لباسِ خاک ہو جاتا ہے آخر کچھ نہ کچھ تن پر
بغور اپنے کو دیکھا ہم نے دو چشمِ حقیقت سے — کیا افسوس اے عارفؔ بہت شیخ و برہمن پر

(۹۵)

کچھ چپ ہیں آئینہ جو وہ ہر بار دیکھ کر — گھورتے ہیں اپنی چشم کو بیمار دیکھ کر
آساں نہیں معاملہ اُس پختہ کار سے — لیتا ہے جنسِ دل کو بھی سو بار دیکھ کر
نازاں ہے اپنی قوتِ بازو پہ کس قدر — پیکاں کی جا وہ سینے میں سوفار دیکھ کر
روتے ہیں اپنے حال پہ پھر کیوں یہ ناسپاس — کہتا ہے میری چشم گوہر بار دیکھ کر

عارفؔ بھرے ہوئے ہیں مضامینِ درد و غم
خوش ہووے کیا کوئی مرے اشعار دیکھ کر

(۹۶)

میکش نہیں، ہیں خلد میں خوش حور دیکھ کر
ہوتے ہیں شاد تاک میں انگور دیکھ کر
یہ بارِ سر میں دوش پہ کب تک لیے پھروں
لیتے ہیں کام طاقتِ مزدور دیکھ کر
آنکھوں کی راہ بھی یہی ملتا ہے ہم نشیں
روتا ہوں کب میں سینے کا ناسور دیکھ کر
دیکھے جو ایک بار میرے گنج تار کو
سمجھے گا پھر وہ دن شب دیجور دیکھ کر
عارف کو ہم تو سنتے تھے بیمارِ عشق ہے
حیرت ہے اس کے چہرے پہ یہ نور دیکھ کر

(۹۷)

وحشت میں یاد آئے ہے زنجیر دیکھ کر
ہم بھاگتے تھے زلفِ گرہ گیر دیکھ کر
جب تک نہ خاک ہوجیے حاصل نہیں کمال
یہ بات کھل گئی ہمیں اکسیر دیکھ کر
عذرِ گناہ داورِ محشر سے کیوں کروں
غم مٹ گیا ہے نامۂ تقدیر دیکھ کر
ہوں تشنہ کام دشتِ شہادت زبس کہ میں
گرتا ہوں آبِ خنجر و شمشیر دیکھ کر
عارفؔ چھپا تو ہم سے ولے ہم تو پا گئے
جو بات ہے یہ رنگ کی تغییر دیکھ کر

(۹۸)

تنگی پہ بھی ایک تنگِ شکر ہے دہنِ یار
شیریں ہے دہن پر نہیں ممکن سخنِ یار
گر، یہ اثر آہ کا باعث نہیں تو پھر
ڈھیلا ہے تنِ یار پہ کیوں پیراہنِ یار
ہے پاؤں کو جویاں خلشِ خار سے راحت
اے دل ہے یہی شاید راہِ وطنِ یار
یارب نہ اثر ہو، کبھی آہ میں میری
عاشق وہ نہیں ہووے جو خاطر شکنِ یار
اُس کا تنِ روشن گلِ خورشید ہے گویا
ایمن ہے سدا، بادِ خزاں سے چمنِ یار
جب سمجھے کہ اک خانۂ ویراں کا ہوں دربان
رضواں کو دکھاووں جو کسی دن چمنِ یار
معلوم نہ ہوویں مرے جس شعر کے معنی
تو جان لے عارفؔ اسے وصفِ دہنِ یار

(۹۹)

ردیف: ز

دی ہم کو جان اور کیا ہم سے زر عزیز
زر جان سے زیادہ ہے وہاں بھی مگر عزیز
تو قوت اپنی ساعدِ نازک میں دیکھ لے
ہے صرف اس کا پاس، نہیں ہم کو سر عزیز
ایسے میں قتل کر، کہ نہ ہو کوئی مدعی
اب تک ہیں، میرے حال سے سب بے خبر عزیز

زلفیں یہ اس نے چھوڑنی عارض پہ چھوڑ دیں
وہ دن گئے کہ تھی، یہ نسیمِ سحر عزیز
عارفؔ کبھو نہ کیجیو حاصل کمال تو
اہلِ ہنر ذلیل ہیں اور بے ہنر عزیز

(۱۰۰)

کس لیے ہے تجھے یہ ہستی نابود عزیز
تجھ کو ہووے گا کبھو اس سے نہ کچھ سود عزیز
اس نے افسردگیِ دل مری کھوئی دم میں
ساقیا اس لیے ہے آتشِ بے درد عزیز
شرک ہے نام عبادت میں سمجھ اے زاہد
نہیں رکھتا ہے دوئی کو کبھو معبود عزیز
قعرِ دریائے محبت پہ فدا کر ہستی
کچھ بھی ہووے جو تجھے گوہرِ مقصود عزیز
دیکھ عارفؔ کے مقابل نہ ہو ہر بار عدو
اپنی تو جان کو رکھتا نہیں مردود عزیز

(۱۰۱)

ہے شبِ وصل ولیکن نہیں ہم شاد ہنوز
رنج و غم ہائے جدائی ہے ہمیں یاد ہنوز
اقربا میرے نہ آجاویں کہیں جلدی سے
پاس سے نعش کے سر کا نہیں جلاد ہنوز
چھوڑتی گرد بھی اپنی نہیں دامن کو ترے
ہو گئے خاک و لے چاہتے ہیں داد ہنوز
ہوگیا محکمۂ روزِ قیامت آخر
زیرِ لب یاں تو ہے ظالم تیری فریاد ہنوز
کوہ میں سینہ پہ ہے لالۂ صحرا کے جو داغ
یاں یہ دستور ہے عارفؔ غمِ فرہاد ہنوز

(۱۰۲)

ردیف: س

کام مرہم کا نہیں تیرے دلِ افگار کے پاس
ڈال دیویں اسے لیجا کے نمک سار کے پاس
مژدہ اے اہلِ جہاں ختم ہوئے سب مجھ پر
اب ستم کوئی نہیں چرخِ ستم گار کے پاس
شکلِ انساں سے وحشت ہے، وہ نفرت ہے ہمیں
جا کے ہوویں نہ کھڑے صورتِ دیوار کے پاس
ہوگئی غم سے مرے اب تو وہ حالت اس کی
ایک غم خوار ہے لازم مرے غم خوار کے پاس
مہ کے لینے سے یہ ممکین نہیں چوں کہ عارفؔ
نقدِ ایمان پہ جب تک کہ ہے مے خوار کے پاس

(۱۰۳)

ہوش رکھتا ہو تو آ، ساقیِ سرشار کے پاس
بھول کر بھی نہ کھڑا ہو، کسی ہشیار کے پاس
سب کے سب مر گئے عشاق کہیں کیا یا رب
اب وہ ہنگامہ نہیں کوچۂ دلدار کے پاس
دو جہاں لگتے ہیں دیکھے سے کسی کے یکسو
کچھ تو جادو ہے تری چشمِ فسوں کار کے پاس

تب بھی نظارے سے، سیری نہیں ممکن ہے اگر
لاکھ آنکھیں ہوں ترے طالبِ دیدار کے پاس
ہو سکے کوئی نہ زنہار بھی ہمسر عارفؔ
میر کے شعر جو لکھے برے اشعار کے پاس

(۱۰۴)

تجھ سے چشم نہ تھی ہم کو چشم تر، افسوس
ہوئی ہے رازِ محبت کی پردہ در افسوس
نہ پوچھ لکھ کے جو خط ہم نے ٹھنڈے سانس بھرے
ابھی سے کرتے ہیں ہم تیرا نامہ بر افسوس
ہمارا نخلِ تمنا ریاضِ عالم میں
ہمیشہ یونہی رہا آہ بے ثمر افسوس
دعائے صبح سنا ہے کہ رد نہیں ہوتی
نہیں ہے لیک شبِ ہجر کی سحر افسوس
یہ تیرا عشق میں کیا حال ہوگیا عارفؔ
ہمیں کمال ہوا تجھ کو دیکھ کر افسوس

(۱۰۵)

ردیف: ش

ہوویں برعکس بھلا کیوں نہ وہ اغیار سے خوش
کسی معشوق کو دیکھا نہ وفادار سے خوش
ہر دعا پر ہمیں دُشنام میسّر ہے کہاں
شامتِ نفس ہے گر ہوویں نہ سرکار سے خوش
نقدِ دل بھی جو کوئی دے کے نہ مانگے بوسہ
وہ ہوا کرتے ہیں بس ایسے خریدار سے خوش
غور سے میں نے جو دیکھا تو کہیں عالم میں
کوئی ہوگا نہ زیادہ ترے بیمار سے خوش
کیا عجب مجھ سے خفا ہووے اگر وہ عارفؔ
کسی معشوق کو دیکھا نہ وفادار سے خوش

(۱۰۶)

پائے نازک کا ترے کیا ہوئے خاکِ گل پہ نقش
جب اٹھا کر تو نے رکھا ہو گیا یاں دل پہ نقش
آشنائے ہجرِ الفت کا ملے کیونکر سراغ
گر نکلتا وہ، تو ہوتے پانی کے ساحل پہ نقش
خاتم دستِ سلیماں سے وہ بہتر ہے مجھے
اس پری کے داغ الفت کا جو ہوئے دل پہ نقش
اس پری کو کس طرح لاوے کوئی تسخیر میں
جو کہ خود اُلٹا بٹھادے سحر سے عامل پہ نقش
اپنا خون اس رنگ سے جو میں نے ثابت کردیا
ہوگئی یہ بات میری عارفؔ اُس کے دل پہ نقش

(۱۰۷)

تجھ پہ قاتل ہے ازل سے مری مائلِ آغوش
کیوں نہ میں کھول کے دوڑوں دمِ بسمل آغوش

دستِ پُرخوں کو نہ گھبرا کے چھپا بغلوں میں
سرخ ہو جائے گی خوں سے مرے قاتل آغوش

ہم ہوا خواہِ بلا ہیں نہ بنے گی تجھ سے
تو ہمیں دیکھ کر بس کھول نہ سائل آغوش

شاہد گل کوئی دن کا ہے چمن میں مہماں
گرم کر لو کوئی دن تم بھی عنا دل آغوش

جن کو یہ سوزشِ دل تری طرح ہو عارفؔ
کرتے پھر سوگئی وہ رہنے میں غافل آغوش

(۱۰۸)

ردیف: ص

جلد کر ایک جگہ حور شمائل مخصوص
ایک جانے کی نہ دیکھی تری محفل مخصوص

کشتیِ نوح کو طوفاں سے بچایا حق نے
عافیت کے لیے مت جانیو ساحل مخصوص

ہوگئی شام جہاں ہم کو وہیں بیٹھ گئے
رہ غربت میں نہیں ہوتی ہے منزل مخصوص

کبھی انداز کبھی ناز کبھی چشم و مژہ
قتلِ عشاق کو ہوتا نہیں قاتل مخصوص

دفترِ دہر میں ایک وہ ہوں میں فردِ باطل
کہ ہوا واسطے میرے خطِ باطل مخصوص

کوچۂ زلف میں اب تک نہیں رکھا ہے قدم
پاؤں کو ہوگئے کیوں میرے سلاسل مخصوص

نہ ملے شیخ اگر پیرِ مغاں ہے عارفؔ
کچھ حرم ہی میں نہیں مرشدِ کامل مخصوص

(۱۰۹)

پڑھ کر کروں جو میں غزلِ عاشقانہ رقص
زہرہ بھی گا کے کرنے لگے شادمانہ رقص

بزمِ طرب جو ساز کرے گلستاں میں تو
بلبل کے ساتھ کرنے لگے آشیانہ رقص

ساقی زبس نگہ سے تیری مست ہوئے ہیں سب
کرنے لگیں گے اب در و دیوار خانہ رقص

اب کے کچھ اور رنگ ہے ابرِ بہار کا
آکر تجھے دکھائے گا سازِ زمانہ رقص

عارفؔ یقیں ہے وہ بھی لگے در سے جھانکنے
پڑھ کر کروں جو میں غزلِ عاشقانہ رقص

(۱۱۰)

واں کرے غیر سے وہ سروِ چراغاں اخلاص
یاں تمھیں، در سے ہوا دیدۂ حیراں اخلاص

دیکھنی ہو جو تجھے دیدۂ رنگیں کی بہار
تو مرے دل سے کرائے دیدۂ گریاں اخلاص

دل نہیں چاہتا گھر سے مرے جانے کو کہیں
کیوں بڑھایا ہے یہ اتنا شبِ ہجراں اخلاص

کون لگتا ہے گلے یوں مرے آکر ہر دم
بارے تو نے کیا خنجرِ بُرّاں اخلاص

کوچۂ یار کا عارفؔ نہ بتا دینگے پتا
ہم سے گو لاکھ کرے روضۂ رضواں، اخلاص

(۱۱۱)

ہو چکی دل کو ترے کاکلِ پیچاں سے خلاص
دائم الحبس کو ہوتی نہیں زنداں سے خلاص

ہم نے جادو سے بنایا ہے یہ دریا میں مکاں
کیا تصور ہو ترا دیدۂ گریاں سے خلاص

بلبلیں کہتی ہیں صیاد ترے دام کو دیکھ
کہ خدا جلد کرے ہم کو گلستاں سے خلاص

موجۂ اشک سے مجھ کو بھی بچالے یارب
نوح کو تو نے کیا صدمۂ طوفاں سے خلاص

سخت حیران ہوں کہ دم سینے میں اٹکا ہے مرا
ہو تو ہو اس کو ترے خنجرِ بُرّاں سے خلاص

صحنِ زنداں میں جو وہ کاتب دکھادے لاکر
مدت العمری میں کیسے ہو زنداں سے خلاص

ہو گیا جب سے کہ (غم) قوتِ ہمارا عارفؔ
ہو گئی ہے ہمیں اس بندِ غم (جا) ناں سے خلاص

(۱۱۲)

ردیف: ض

دل لے کے مجھ سے کہتے ہو، ہے تجھ سے کیا غرض
بس کیا کہوں کہ اب سے ہیں ہم ایک لاغرض

پامال گو بصورتِ نقشِ قدم ہوا
میں آستاں سے اس کے نہ ہرگز، اٹھا غرض

مشہور ہے کہ یار کی یاری سے کام ہے
مغلوں سے مرے رکھتے ہیں کیوں آشنا غرض

دریائے غم کا در تو نہیں کیا کروں بیاں
معلوم اس کی کچھ نہ ہوئی انتہا، غرض

عارفؔ نہ تو ہی گھر میں ہوا ننگِ خاندان
ہم کو نہیں ہے تجھ سے کچھ اے بے حیا غرض

(۱۱۳)

لوں میں افلاس میں کیا اس بتِ جوہر سے قرض
کس کی شامت ہے کہ مانگے وہ ستمگر سے قرض

ابرِ نیساں جو گوہر دیوے تو کیا ہے احساں
لے گیا تھا یہ میری چشم گوہر ریز سے قرض

کیا ترا دیکھ کے دیویں تجھے وحشت مجنوں
مانگتا ہے جو مرے دشتِ جنوں خیز سے قرض

نقدِ دل پاس ہو سو دیوے وہ قیمت موجود
کس لیے پھیریں کروں زلفِ دل آویز سے قرض

چھوڑ کر سر کو مرے مرا عدو بھی عارفؔ
لے سکوں موت اگر طالعِ پرویز سے قرض

(۱۱۴)

ردیف: ط

لکھ کے جب اس کے لیے ہم نے کیا تیار خط
اُڑ گیا آ کر ہوائے شوق میں یکبار خط

طاقتِ تحریر کب ہے ناتوانی سے ہمیں
کیا نہ لکھتے تم کو اس عرصے میں ہم سو بار خط

دل میں یہ کیا آ گئی جواب کے پڑھ کر رکھ لیا
چاک کرتے تھے وگرنہ وہ میرا سو بار خط
دے اُدھر ہی جام ایک بھر کر خطِ تعداد تک
نشے میں سوجھے اگر اے ساقیِ سرشار خط
حال روزِ ہجر کا ہرچند لکھا مختصر
تس پہ بھی عارف یہ کیسا ہو گیا طومار خط

(۱۱۵)

وہ تیرے عارض پہ نکلا اے پری رخسار خط
جس نے کھینچا صفحۂ رخسار پر یکبار خط
ہو گئے سب قتل تھے دنیا میں جتنے نامہ بر
پہنچنا تو ان کو کیا موقوف اب لاچار خط
مہربانی سے ذرا کاغذ کو کردو سرخ تم
یار کو لکھتا ہوں میں اے دیدۂ خونبار خط
مر گئے آخر نہ آیا پر تمھیں ہرگز یقیں
حال کے اپنے لکھے ہم نے تمھیں سو بار خط
دل پھٹا جاتا ہے عارف ہم کو معذور رکھ
کب لکھا جاتا ہے ترے حال کا اے یار خط

ردیف: ظ

(۱۱۶)

خونِ دل سے جو ملا دیدۂ خونبار کو حظ
بادۂ ناب سے ملتا نہیں مے خوار کو حظ
اس کا جو لطف ہے کوئی میرے سر سے پوچھے
تری دیوار سے کیا صورتِ دیوار کو حظ
اس نے منہ پھیر لیا قتل جو کر (کے) قاتل
میرے خوں سے نہ ملا کیا تیری تلوار کو حظ
پاؤں پڑتے ہیں میرے آ کے بیاباں میں سدا
آبلوں نے وہ دیا وادیٔ پُرخار کو حظ
اس میں ہوتے نہیں موجود خود آ کر عارف
سچ تو یہ بات ہے دنیا سے ہے زردار کو حظ

(۱۱۷)

ناصح ترا میں کرتا تھا پہلے بڑا لحاظ
سر چڑھ کے تو نے آپ سے کھویا برا لحاظ
دل میں کیا ہے گھر مرے اور مجھ سے ہے حجاب
سارے جہاں سے آپ کا دیکھا سنا لحاظ
دل دے کے نام و ننگ کو رکھا ہے طاق پر
وارستہ ہو گئے ہمیں کس کا رہا لحاظ
یوں گل کی سب کے سامنے پردہ دری نہ کر
کر عشقِ عندلیب کا بادِ صبا لحاظ
عارف سمجھتے ہیں تجھے دیوانہ سب کے سب
کرتے ہیں منہ پہ آ کے مگر آشنا لحاظ

(۱۱۸)

ردیف: ع

میں کیا کہوں کہ نار سے کیا گل کھلائے شمع
منہ سے اگر وہ پھونک کے اپنے بجھائے شمع

مجھ کو جلا کے کس لیے وہ پھر جلائے شمع
جلتا ہوں اس کی بزم میں ہر شب بجائے شمع
ہو جائے جل کے شعلہ اگر خاک تو سہی
ایک دن تو سوزِ دل کو مرے آزمائے شمع
محفل میں تیرے سامنے کرتی ہے سرکشی
کاٹوں میں اس کا سر کہ یہی ہے سزائے شمع
فراش رکھ تو بزم میں اس شعلہ رو سے دور
تا گھل کے ایک دم میں کہیں بہہ نہ جائے شمع
سو سو طرح سے جب وہ جلاتا ہے کیا عجب
چربی سے عاشقوں کی بھی ایک دن بنائے شمع
عارف بجا ہے برقعِ فانوس میں نہاں
اُس شعلہ رو کو شرم سے کیا منہ دکھائے شمع

(۱۱۹)

کب تابِ رخ کو پہنچے ہے اس کی ضیائے شمع
اُس مہروش کو دیکھ کے کیوں بجھ نہ جائے شمع
کیا روشنی کی ہے ترے عاشق کو احتیاج
ہے آہِ شعلہ خیز میرے گھر میں جائے شمع
معشوق ہے تو، صورتِ عاشق جلے ہے کیوں
کچھ آج تک نہ ہم کو کھلا ماجرائے شمع
آنکھیں نہ ہوں تو نورِ حقیقت کا کیا قصور
حاصل جو کدر سامنے شب کو جلائے شمع
کیا زندگی کا اس کو بھروسا ہے وقتِ صبح
کیونکر نہ اُس طرف کو بس اب لَو لگائے شمع
محفل میں اپنے ساعدِ سیمیں تو کھول دے
مل جائے تا یہ خاک میں ساری صفائے شمع
گم نام کیوں ہوں نام نہ روشن کریں اگر
عینِ بقائے شمع ہے عارف فنائے شمع

ردیف: غ

(۱۲۰)

بہرِ عشرت گر گلستاں میں کروں روشن چراغ
سبزہ اپنے دود سے ہو چوں گلِ سوسن چراغ
بن گئے سروِ چراغاں ہم جو بزمِ یار میں
ہو گئے ہیں سر سے پا تک داغ ہائے تن چراغ
رازہائے دل جلے جاتے ہیں سوزِ داغ سے
برق ساں دیکھو جلاتا ہے برا خرمن چراغ
اُس کا دل ہو نرم تاثیرِ دلِ سوزاں سے کیا
ہم نشیں پگھلا نہیں سکتا کبھی آہن چراغ
ہے دلِ روشن میں عارف راہ کب شیطان کو
سامنے آتا نہیں ہے دیکھ کے رہزن چراغ

(۱۲۱)

دل پہ داغِ آتشیں کا ہے سدا روشن چراغ
یہ فسونِ عشق ہے جلتا ہے بے روغن چراغ
حال تھا معلوم اس ظلمت کدے کا کیا انھیں
ہاتھ میں نکلے ہیں لے کر جو گل و گلشن چراغ

گرمیٔ رفتارِ حسنِ برق وَش سے یار کی | خاک پر ہے میری ہر نقشِ سُمِ توسن چراغ
یاں تلک پہنچا ہوں کس کس آرزو سے سرد مہر | سالہا مسجد میں مَنّت کیے گئے روشن چراغ
کس بہ رشتہ دل نے اُف کی ہے کہیں یہ ناگہاں | انجمن میں ہو گئے جو خود بخود روشن چراغ
گو زباں رکھتا ہے پر کہتا نہیں یہ منہ سے کچھ | ہے مگر، روزِ ازل سے خلق میں اَلکن چراغ
گر غزل خوانی کروں تو وہ ہو عارفؔ سکو وجد | ذوق میں آ کر ہلاوے بزم میں گردن چراغ

(۱۲۲)

وہ کینہ کیش آوے مرے گھر دروغ دروغ | بکے ہے کس لیے تو نامہ بر دروغ دروغ
سُنی جو غور سے باتیں انھوں کی، تھیں نمکیں | دہَن ہو یار کا تنگ شکر دروغ دروغ
یہ دیتے ہیں شعرا بال سے یونہی نسبت | انھوں نے دیکھی ہو اس کی کمر دروغ دروغ
ثمر جو سرو میں آوے تو کچھ بعید نہیں | ہماری آہ میں ہووے اثر دروغ دروغ
یہ چشم غیر نے مل مَل کے سرخ کر لی ہے | ہوا ہو میری طرح خوں جگر دروغ دروغ
یہ غمگسار یونہی مجھ کو دیتے ہیں تسکیں | شبِ فراق کی ہووے سحر دروغ دروغ
سحر ہے سنگدلی ان کی دہر میں عارفؔ | وہ روتے ہوں میری سن کے خبر دروغ دروغ

(۱۲۳)

کیونکر تمھارے عشق میں ہو، ناگوار داغ | دیوے بہار سینہ پہ جب لالہ زار داغ
تو ہی کبھو مرے جگر و دل کی سیر کر | الفت میں ترے کھائے ہیں میں نے ہزار داغ
تن پر نہیں جراحت تیغ الم سے جا | کھاتا تمھارے حیلے کی میں لاکھ بار داغ
ڈرتا ہوں غش نہ آوے کہیں اُس کو سہم کر | ہرگز دکھائیو نہ دلِ بے قرار داغ
عارفؔ جگر کے ٹکڑے بھی کچھ اُس کے گرد ہوں | دیوے بہار سینہ پہ جب لالہ زار داغ

(۱۲۴)

ردیف: ف

پامال ہووے یوں ہی میرا جسم زار، حیف | آنکھوں میں غیر کے نہ لگے ہو کے خار حیف
نے صحنِ باغ اور نہ مئے خوشگوار حیف | یوں صاف جائے اب کے یہ فصلِ بہار حیف
آنے کا وعدہ کر کے رقیبوں کے گھر گیا | ہم در پہ اس کے بیٹھیں کریں انتظار حیف
اُس کے سوا نہیں کوئی دُشنام کا سبب | میری دعا بھی آپ کو ہو، ناگوار حیف

کیا ہے کلامِ میر سے میرا کلام کم پر قدرداں نہیں کوئی عارفؔ ہزار حیف

(۱۲۵)

رات بھر ہم نے نہ کی دل کی کہانی موقوف وصل میں بھی نہ ہوئی مرثیہ خوانی موقوف
ہونا بازار میں شرمندہ کہ ہے رسمِ قدیم کچھ یہ تجھ پر ہی نہیں یوسفِ ثانی موقوف
شاد ہوتا ہوں کہ دل میں نہیں خامی باقی گر ہووے چشم سے خونابہ فشانی موقوف
بند ہو جاتے ہیں شیرینی سے لب قاصد کے بھیجنا کیجیے پیغام زبانی موقوف
سامنے سب کے ہے کچھ چیز چراتا کوئی انجمن میں تو کرو آنکھ چرانی موقوف
نفسِ سرد اگر اک لبِ ساحل کھینچوں صفتِ برق ہو دریا کی روانی موقوف
زندگانی کا نہیں کچھ بھی بھروسہ عارف معصیت چھوڑ دے کر عذرِ جوانی موقوف

(۱۲۶)

چشمِ عبرت ہو تو دیکھ اس خانہ ویراں کی طرف کیا کرے گا جا کے تو، گورِ غریباں کی طرف
گریۂ یعقوب میں ہوتا اثر تو خود بہ خود کاروانِ مصر آجاتا، یہ کنعاں کی طرف
ساکنانِ کوچۂ جاناں نے روزِ حشر میں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا باغِ رضواں کی طرف
آشیانوں سے نہ نکلو ہم سفیرانِ چمن آج پھر صیاد آتا ہے گلستاں کی طرف
اس کو ضائع کرنا عارفؔ وادیِ پُرخار میں ہے سگِ جاناں بھی مائل تیرے داماں کی طرف

(۱۲۷)

ردیف: ق

گو دل کو خوب کھول کے ٹوٹے ہزار برق پر میرے دل کی طرح نہ ہو بے قرار برق
برسے اگر ذرا میری کشتِ امید پر ضد سے جلاوے دامن ابرِ بہار برق
اُس شوخ برق وش کے تصور سے ناگہاں آنکھوں میں کوند جاتی ہے بے اختیار برق
کھینچوں میں جس جگہ نفسِ سرد بیٹھ کر اُس دشت میں جلا نہ سکی ایک خار برق
اس شوخ شعلہ خو کا یہ عارفؔ خیال ہے کرنے لگی ہے، دل میں مرے گداز برق

(۱۲۸)

سر میں پھرے ہے میرے تمھاری ہوائے شوق لازم ہے سوئے آگرہ مجھ کو اڑائے شوق
گھبرا کے شب وہ گھر سے نکل آئے یک بہ یک ہے آہِ بااثر مری حاجت روائے شوق

دیکھا کرے یہ دیدۂ تر صد ہزار حیف — اور آگ میرے خانۂ دل میں لگائے شوق
کل نبض میری دیکھ کے بولے یہ چارہ گر — جز وصلِ یار اور نہیں ہے دوائے شوق
آنکھیں تو انتظار میں کب کی ہوئیں سفید — اب دیکھتے ہیں اور ہمیں کیا دکھائے شوق
رضواں ریاضِ خلد میں وہ دل لگی کہاں — کس طرح دل سے کوچۂ جاناں کا جائے شوق
عارف نہ بعدِ مرگ بھی ہم سے جدا ہوا — دیکھی یہ ہم نے اس کی طلب میں وفائے شوق

(۱۲۹)

ردیف: ک

تم جو کہتے ہو کہ آویں گے ترے ہاں کل تک — کون جیتا ہے جدائی میں مری جاں کل تک
تیرے وحشی کا اگر خاک اڑاتا ہے یہی — کہیں ڈھونڈا بھی، نہ پاوے گا بیاباں کل تک
کچھ بھی کہتے ہیں جراحت کی میرے اے ہمدم — اکتفا کیونکہ کرے ایک نمکداں کل تک
دور سے گر اُسے تصویر دکھادوں تیری — آپ میں آوے نہ پھر شاہدِ کنعاں کل تک
خاک میں آج وہ سر ٹھوکریں کھاتے ہیں پڑے — جو امارت کا کیا کرتے تھے ساماں کل تک
دل لگاتی ہے عبث اپنے لیے اے بلبل — ڈھونڈنے پاوے گی، نہ گلہائے گلستاں کل تک
کیا نظر کام کرے اس کے دہن پر عارف — لاکھ دیکھا کرے یہ دیدۂ حیراں کل تک

(۱۳۰)

تھا جو وہ زہرہ جبیں گھر مرے مہماں کل تک — کیا طرب خیز تھا یہ کلبۂ احزاں کل تک
آج کا کل پہ نہ رکھ کام کہ معلوم نہیں — کیا دکھاوے گی تجھے گردشِ دوراں کل تک
گر اسی طرز کی ہے ناصیہ سائی میری — نظر آوے گا نہ سنگِ درِ جاناں کل تک
خاک اس ضعف میں اب اشک میں پوچھوں کس سے — چشم تک آ نہ سکے، گوشۂ داماں کل تک
عارف ایک رند ہے کفر پہ ہو اس کے یقیں؟ — کیا تعجب ہے کہ ہو جائے مسلماں کل تک

(۱۳۱)

قند و نبات کی سی حلاوت زباں تلک — لذت ہے زہرِ غم کی مگر کام جاں تلک
اس سے عزیز ہم نے نہ کی اپنی جاں تلک — نوبت نہ آئی ہائے کبھی امتحاں تلک
کس دن کے واسطے ہے پھرا اے چشم دجلہ ریز — پہنچی ہے اب تو آتشِ غم مغزِ جاں تلک
کیوں رکھ دیے کسی نے ہماری لحد پہ گل — (پہنچے) خبر کہیں نہ یہ اُس بدگماں تلک

حیرت ہے ہم کو اب کہ اس سر کو ضعف میں — کیونکر اٹھا کے لائے تیرے آستاں تلک
پوشیدہ دل میں آتے ہیں یوں غم کے قافلے — دم مارتا نہیں جرسِ کارواں تلک
خالی دکھائی دیتی نہیں اس سے کوئی جا — عارف نگاہ بھر کے جو دیکھا جہاں تلک

(۱۳۲)

قائل بھلا ہوں نامہ بری میں صبا کی خاک — پھرتی ہے وہ بھی گلیوں میں اکثر اڑاتی خاک
کہتا ہوں سوزِ دل سے کہ کر چک جلا کے خاک — ایک بات پر جو یار نے جانی اٹھا کے خاک
کیا کانپتا ہے نالۂ سوزاں سے اے فلک — جب بات تھی کہ مجھ کو کیا ہو جلا کے خاک
پانی نکل کے دشت میں جاری ہے جا بجا — یارب گیا ہے کون یہ سر پر اڑا کے خاک
دامن اٹھا اٹھا کے جو بچتا ہوا چلا — کیوں ہوویں مر کے کوچے میں اس بے وفا کے خاک
رضواں عبیر خُلد سے بدلوں نہ زینہار — خوشبو ہے کوچہ میں وہ میرے مہ لقا کے خاک
عارفؔ کو یارو ہم تو سمجھتے تھے اہلِ دیں — دریا میں لوگ آئے ہیں اس کی بہا کے خاک

(۱۳۳)

ردیف: گ

لگ رہی ہے رونے پر بھی اس دلِ سوزاں میں آگ — ہم سمجھتے تھے بجھے گی شدت باراں میں آگ
واں نہ لے جا ساتھ اس تفدیدہ دل کو اے خضر — لگ اٹھے گی ناگہاں جس چشم حیواں میں آگ
وادیِ ایمن میں اس کی ہے یہ چنگاری کلیم — لگ رہی ہے وہ جو مرے سینۂ سوزاں میں آگ
کیا کہوں عالم سے کتنا ان دنوں افسردہ ہوں — بجھ کے ہووے سرد، لے لوں میں اگر داماں میں آگ
گرم رفتاری کا اس کی جب تصور آگیا — لگ گئی ہے میرے اس دم، دیدۂ گریاں میں آگ
جب کہ کانٹوں کو نہ لایا میں ذرا بھی دھیان میں — غیر نے ہر جا بچھا دی کوچۂ جاناں میں آگ
سوزشِ غم کے مضامیں، اِس میں لکھے ہیں بہت — خوف ہے عارفؔ نہ لگ اٹھے میرے دیواں میں آگ

(۱۳۴)

جاں ٹھہرایا ہے تم کو ہائے کیا کہتے ہیں لوگ — ہم مرے جاتے ہیں تم کو بے وفا کہتے ہیں لوگ
صبح بے خود بیٹھے بیٹھے ہم تو ہو جاتے ہیں کچھ — بو تیری زلفوں کی لاتی ہے صبا کہتے ہیں لوگ
خوں میرا کرتے ہی اس نے سب کو اندھا کر دیا — ہاتھ پر قاتل کے جو رنگِ حنا کہتے ہیں لوگ

اُس سے ملنے کی بتادے کوئی تو ہم کو بھی راہ / اے خضر عالم میں تم کو رہنما کہتے ہیں لوگ
سچ ہے کس غارت گر ایمان و دیں کو دل دیا / جو میرے کہتے ہیں حق میں سو بجا کہتے ہیں لوگ
ڈال دو لے جا کے مجھ بیمارِ غم کو بھی وہیں / کوچۂ دلدار کو دار الشفا کہتے ہیں لوگ
عقدہ ہائے کار عارفؔ کے بھی کھل جاویں کبھی / ساقیِ کوثر تمھیں مشکل کشا کہتے ہیں لوگ

(۱۳۵)

ہووے جو رخشِ ناز کا وہ شہ سوار تنگ / ہو جاوے عرصہ، چرخ پہ، پھر غنچہ وار، تنگ
وہ اژدہامِ غم ہے کہ ہلنے کی جا نہیں / سینے میں آگیا ہے دلِ بے قرار تنگ
اس چشمِ دجلہ ریز سے دریا نوال ہیں / ہے مفلسی سے ہاتھ ہمارا ہزار تنگ
ہے پست، بسکہ، سقفِ فلک کیونکہ اٹھ سکے / آیا ہے بیٹھے بیٹھے ہمارا غبار تنگ
ہوں بے خطر کہ آ نہ سکیں منکر و نکیر / کچھ گھر سے میرے کم نہیں کنجِ مزار، تنگ
تو سامنے ہمارے بس اپنی زباں نہ کھول / ہے حسن یہ کہ ہووے دہانِ نگار تنگ
عارفؔ دیے ہیں عشق نے لاکھوں کو گنجِ غم / آتے ہیں سائلوں سے کوئی مایہ دار، تنگ

(۱۳۶)

ردیف: ل

صد چاک تو دیکھا ہے سدا پیرہنِ گُل / معلوم ولے کچھ نہیں رنج و محنِ گُل
وا بہرِ تکلم تو ہے بُلبل، دہنِ گل / پر ہم کو سنائی نہیں دیتا سخنِ گُل
ہے محفلِ عشرت بھی یہی عالمِ غربت / طرفہ چمنستانِ سوادِ وطنِ گُل
ہر چند نہیں کچھ ترے رخسار سے نسبت / کس واسطے پر، ہو جیے خاطر شکنِ گُل
اے بادِ صبا، اس کی، میں رگ رگ سے ہوں واقف / بے وجہ نہیں ناصیہ پر یہ شکنِ گُل
واں نخلِ مغیلاں بھی نظر اب نہیں آتا / آنکھوں سے جہاں دیکھے ہیں ہم نے چمن گُل
کچھ بات کہے منہ سے جو اُس غنچہ دہن کی / میٹھا میں کروں قند سے عارفؔ دہنِ گُل

(۱۳۷)

تجھ پر فدا ہے جان ہماری نثار دل / صدقے کریں جو پاس ہو اپنے ہزار دل
ان میں خدا ہی جانے میرا دل ہے کون سا / ہیں رہ گزر میں تیری پڑے بے شمار دل
دریا تجھے تو چاہیے ہیں خوں کے چشمِ تر / لاؤں کہاں سے تیرے لیے میں ہزار دل

اُس رشکِ گل نے یہ بھی تو پوچھا نہ ایک دن
رہتا ہے کیوں گرفتہ ترا غنچہ وار دل

تاثیرِ جذب کاکلِ جاناں ہی سے نہ ہو
رہتا ہے اب جو سینے میں کچھ بے قرار دل

کب چھوڑتا ہے تیرے تصور کو ایک پل
کرتا نہیں ہے چشم کا بھی اعتبار دل

عارف گناہ کیجو سارے جہان کے
لیکن لگائیو نہ کہیں زینہار دل

(۱۳۸)

ردیف: م

رہتے وحشت میں تھے کس عزت و توقیر سے ہم
قید میں اور گراں ہوگئے زنجیر سے ہم

لے سکے دل کو نہ ہرگز کسی تدبیر سے ہم
ہوئے سر پر نہ تیری زلفِ گرہ گیر سے ہم

ہو برا سوزِ جگر کا کہ کیا خاکستر
دل کو بہلاتے تھے ہر وقت تیرے تیر سے ہم

جب بھی رہتا ہے ہمیں حرفِ شکایت کا خیال
بات کرتے ہیں اگر یار کی تصویر سے ہم

گرد دامن پہ نہیں بیٹھنے دیتے اپنے
محترز ہوویں نہ پھر کس لیے اکسیر سے ہم

ہم نشیں تجھ کو دکھاویں گے نمائش اپنی
اس کی محفل میں تو پہنچیں کسی تدبیر سے ہم

اس کے گھر لے گئے تجھ کو تو وہ کرتا نہیں بات
سخت حیران ہیں عارف تیری تقدیر سے ہم

(۱۳۹)

شبِ وصال میں بیزار ہیں شراب سے ہم
کہ آج رکھتے ہیں صد نام آفتاب سے ہم

یہی ہے چشمۂ آبِ حیات بس اے خضر
نہ بدلیں اس کو تو ایک قطرۂ شراب سے ہم

وجودِ ہستیِ موہوم کیا کھلتے ہم پر
کہ چاہتے ہیں صدا کامِ حباب سے ہم

نہیں فراق میں ممکن ہو ضبطِ تارِ نفس
کہ اور ہوگئے مضبوط پیچ و تاب سے ہم

ہوئے ہمیشہ کو، رنجِ خمار سے فارغ
ملا کے آنکھ کسی چشمِ نیم خواب سے ہم

چلے ہیں دیر سے اٹھ کر سوئے حرم عارف
رہِ خطا پہ پھر آئے رہِ صواب سے ہم

(۱۴۰)

چراغِ خانہ جو روشن کریں شراب سے ہم
ملاویں پھر تو اُسے صبح آفتاب سے ہم

یہ گنجِ درد و الم عمر بھر کو کافی ہے
سمجھ کے خرچ کریں گے اگر حساب سے ہم

شبِ فراق میں اللہ دل کا مالک تھا
زباں پہ لا نہ سکے پھر بھی کچھ حجاب سے ہم

وہ شورِ عشق کی رگ رگ میں ہوگئی تاثیر
شراب پی کے رہے مجتنب شراب سے ہم

تمھاری زلف سے ہووے گی کس طرح سر بر
نہیں ہیں عہدہ برا دل کے پیچ وتاب سے ہم
خطر نہیں ہے تیری برقِ حسن سے ہم کو
یہ جانتے ہیں کہ نازک نہیں عقاب سے ہم
سنی بس اپنی ہی عارف صدائے کوسِ رحیل
لگانے بھی نہیں پائے تھے پا، رکاب سے ہم

(۱۴۱)

بن کے اس کاشانۂ ویراں کو کر کے برباد ہم
وسعتِ کُنجِ لحد سے ہوتے ہیں کیا شاد ہم
بے کسوں کے قتل پر ہوتا ہے کس کو رنج وغم
سر پر اپنے کون رکھتے ہیں بجز جلاد ہم
کوہ کو پگھلاویں ہم اک نالۂ پُر درد سے
کیوں کریں خارا کنی تیری طرح فرہاد ہم
کیا بُرا کرتے ہیں زاہد یاں بنا کر میکدہ
چوگنا شہرِ حرم کو کرتے ہیں آباد ہم
ہم سے یہ حالِ زبوں دیکھا نہیں جاتا ہے اب
کاش اُس سے ہوتی عارف کو ....

(۱۴۲)

رازدارِ عشق وہ ہیں اے ستم، ایجاد ہم
چرخ کے پردے میں تیری کرتے ہیں فریاد ہم
دور ہو دل سے ترے کینا کبھی ممکن نہیں
محو کر سکتے ہیں کوئی جوہرِ فولاد ہم
گر خطا ہم سے کوئی سرزد ہوئی تو کیا عجب
یارب آخر حضرتِ آدم کی ہیں اولاد ہم
رکھتے ہیں دل میں خیالِ چشمِ مخمور اے میاں
ڈالتے ہیں کعبے میں میخانے کی بنیاد ہم
حضرتِ غالبؔ کی شاگردی کا ہے ادنیٰ یہ فیض
عقلِ اول کے جو عارفؔ ہو گئے استاد ہم

(۱۴۳)

پاتے نہیں ہیں دل کو تو چاہِ ذقن میں ہم
دیکھیں، کہو تو زلفِ شکن در شکن میں ہم
دربان اس کا جو ہمیں کہتا ہے بے حیا
اب ڈال دیں گے آپ کو دیوانہ پن میں ہم
لاشہ پر آئے کس لیے تم ڈال کر نقاب
منہ کو چھپا چکے ہیں جب اپنے کفن میں ہم
آتا ہے یاد جب قدِ موزوں ترا ہمیں
کیا لوٹتے ہیں سایۂ سروِ چمن میں ہم
عارفؔ ہوئے ہیں حضرت غالبؔ کے خوشہ چیں
کیونکر نہ ایک رکن ہوں ملکِ سخن میں ہم

(۱۴۴)

ردیف: ن

ایسا پڑا ہے عیب کچھ اس دل کی چاہ میں
جو ہو گئے ذلیل سبھوں کی نگاہ میں

یوں چپکے بیٹھے سنتے نہ یہ طعنے اقربا | ہوگا اگر ذرا بھی اثر اپنی آہ میں
جاسوس ہیں ترے کہیں درباں کہیں رقیب | حارج ہیں کیسے کیسے تیرے گھر کی راہ میں
ہم کو خیال شہپرِ عنقا کا آگیا | خنجر کو دیکھ کر کمرِ کج کلاہ ہیں
عارف تصورِ دُرِ دندانِ یار نے | موتی پرُو دیے ہرے تارِ نگاہ میں

(۱۴۵)

کیا کہیں لوگوں میں ہم کیا کہنے کو ہیں | آج سارا اپنے دل کا مدعا کہنے کو ہیں
ضبط کی طاقت نہیں اب دل بہت بیتاب ہے | جو ہمارے دل میں ہے وہ برملا کہنے کو ہیں
صبح مل کر جائیو تو ہم سے کوئے یار میں | کچھ اُسے پیغام اے بادِ صبا کہنے کو ہیں
دل کو اپنے تھام لو رکھ لو جگر پر اپنے ہاتھ | اے عزیزوں ہم کچھ اپنا ماجرا کہنے کو ہیں
تو کسی سے کہہ نہ بیٹھے ہم کو ایک یہ خوف ہے | تجھ سے ہم ایک بھید عارف یار کا کہنے کو ہیں

(۱۴۶)

جا پڑی بات جو یہ اُس بتِ عیار کے کان | سچ کہی ہے یہ مثل ہوتے ہیں دیوار کے کان
تجھ سے ہم چشمی و شوخی ہو نرگس کو | چشم کاٹے ہے تری آہوئے تاتار کے کان
روکشی خوب نہیں عارضِ جاناں سے تجھے | کھول دے جا کے صبا تو گل وگلزار کے کان
بات کرنے کا جو یارا ہو کسی صورت سے | بہرے ہو جائیں یہ سبھی میرے اغیار کے کان
حالِ دل اپنا سناؤں اُسے کیا کیا عارف | وہ لگا دے جو ذرا سننے کو اشعار کے کان

(۱۴۷)

جوشِ گریہ پھر ہے اپنے دیدۂ پُرآب میں | آ پھنسی ہے کشتیِ گردوں کہیں گرداب میں
ہے خیالِ چشم فتاں اس دلِ بیتاب میں | نرگسِ شہلا اُگی ہے معدنِ سیماب میں
یادِ رفتارِ صنم میں سوگیا تھا رات کو | صبح تک دیکھا کیا شورِ قیامت خواب میں
چھوڑ دے تو عارضِ روشن پہ یہ زلفِ عنبریں | ورنہ کیفیت نہ ہوگی کچھ شب مہتاب میں
اس قدر کثرت سے ہے عارف تصور یار کا | خواب کو ہرگز نہیں جا دیدۂ بے خواب میں

(۱۴۸)

ہم رقیبوں کے یہ سب فتنہ وشر دیکھ تو لیں | نظرِ لطف سے وہ گاہ اُدھر دیکھ تو لیں
نالہ وآہ سے بھی لے ویں گے کام آخرکار | اے دعائے سحری تیرا اثر دیکھ تو لیں

موشگافی کا جنھیں آج بہت ہے دعویٰ — وہ بھلا اُس بُتِ نازک کی کمر دیکھ تو لیں
گرم جوشی وہ رقیبوں سے خدا کی قدرت — آرزو ہم کو یہ ہے، کاش اِدھر دیکھ تو لیں
پھینک دے جو تو، فلک کھود کے پھر نخلِ مراد — لیکن اک بار ہی ہم اُس میں ثمر دیکھ تو لیں
وہ سرہانے میرے بیٹھے ہیں، مدداے طاقت — کہ اٹھا کر انھیں ہم گھٹنے سے سر دیکھ تو لیں
چھوڑنی تو ہمیں بیشک ہے یہ اک دن عارفؔ — آزما کر ابھی قسمت کو مگر دیکھ تو لیں

(۱۴۹)

ہم کسی ڈھب سے تجھے رشکِ قمر دیکھ تو لیں — اس قدر اپنے میں ہے تابِ نظر دیکھ تو لیں
بعد ڈھونڈیں گے تیری زلفوں میں دل کو اپنے — جا کے ہم پہلے تیرا راہ گزر دیکھ تو لیں
اس تمنا میں کھڑے رہتے ہیں پہروں جا کر — نہ سہی میری طرف جانبِ در دیکھ تو لیں
ضبطِ گریہ نہیں بہتر ہے ابھی اے ہمدم — مجھ کو وہ روتے ہوئے خونِ جگر دیکھ تو لیں
پوچھنا کیا ہے کہ اب ہم سے موافق وہ ہو — ہاں یہ طاقت ہے رقیبوں کی ادھر دیکھ تو لیں
پڑ گئی رات سے کیوں جانے کی جلدی مجھ کو — آپ کے منہ کو ذرا وقتِ سحر دیکھ تو لیں
سود و نقصان تو قسمت کا ہے اپنی عارفؔ — کر کے ہم مُلکِ محبت کا سفر دیکھ تو لیں

(۱۵۰)

پند گو مجھ کو بُرا، خواہ بھلا کہتے ہیں — میں سمجھتا ہی نہیں کچھ کہ یہ کیا کہتے ہیں
تیرے آتے ہی جو ہر ایک نے منہ کھول دیا — تجھ سے گلہائے چمن کچھ تو صبا کہتے ہیں
دے چکا ہے تیرے بیمار کو عیسیٰ تو جواب — لبِ جاں بخش تیرے دیکھیے کیا کہتے ہیں
امتحانِ دلِ عشاق تھا ہم کو منظور — اپنے ہاتھوں میں لگا کر وہ حنا کہتے ہیں
استعارات کے ہیں بس کہ وہ مُوجدِ عارفؔ — دہن و موئے کمر کو وہ وفا کہتے ہیں

(۱۵۱)

دھو کے وہ دستِ نگاریں سے حنا کہتے ہیں — بدگماں دیکھیے اس رنگ کو کیا کہتے ہیں
ہو سعادت بھی میرے بختِ زبوں (میں) شاید — جائے تاریک میں ہے آبِ بقا کہتے ہیں
شکوۂ جور و جفا تجھ سے نہیں ہے ہرگز — اپنی تقدیر کو ہم آپ بُرا کہتے ہیں
اس طرح بہر کو جواز میں دکھاوے تو کوئی — چھوڑ کر چہرے پہ وہ زلفِ دوتا کہتے ہیں
سیرِ گلزار چمن تجھ کو مبارک منعم — کنجِ مرقد کو ہم اندوہ رُبا کہتے ہیں

اس سے امید شہادت بھی نہیں اب کے عدو — اُس کے آگے درجاتِ شہدا کہتے ہیں
آن پہنچی ہے غمِ یار میں لب تک عارفؔ — اور نکلی نہیں اس جان کو کیا کہتے ہیں

(۱۵۲)

بے نمک زخمِ جگر ہو اُسے کیا کہتے ہیں — وہ ہی حاصل نہ ہوا جس کو مزا کہتے ہیں
ہے تصور بھی ترا دل میں ہمارے موجود — آتشِ ہجر میں، اتنا نہ جلا، کہتے ہیں
ایک عالم کے ہے سر پر یہ ہمارا احسان — برملا اس کی جو زلفوں کو بلا کہتے ہیں
کر خیال اپنی نزاکت پہ ذرا اے ظالم — اس قدر ہم پہ، نہ بہتان اٹھا، کہتے ہیں
وہ جو آہِ دلِ سوزاں سے میری واقف ہیں — نفسِ گر میں جہنم کو صبا کہتے ہیں

مقطع ندارد

(۱۵۳)

وہ کہ جس کو شرفِ ارض و سما کہتے ہیں — مشتمل حسنِ بشر نورِ خدا کہتے ہیں
وہ کہ جس کے قدموں کو بہ چشم معنی — سروِ بے سایہ و گلزارِ صدا کہتے ہیں
سرورِ کون و مکان یعنی رسولِ عربی — جس کو ایک مظہرِ الطاف و عطا کہتے ہیں
مگسِ خوانِ کرم ہو تری اے بحرِ کرم — مرتبہ یہ ہے کہ مانند ہما کہتے ہیں
اثرِ مرتبہٗ نعت ہے سنیے عارفؔ — مرحبا سب مجھے مسکانِ سما کہتے ہیں

(۱۵۴)

ہو جائے گر رقیب ہماری تو کیا عجب — اکثر وہ اپنے رکھتے ہیں تصویر ہاتھ میں
ان کی کمر لچکتی ہے از بس کہ بوجھ سے — چلتے ہیں لے کے زلفِ گرہ گیر ہاتھ میں
کہتا ہے میری گرمیِ سوزِ دروں کا حال — کافور لے کے کاتبِ تقدیر ہاتھ میں
جاتا ہے اُس کے در سے سلیماں لیے ہوئے — توقعِ صوبہ داریِ کشمیر ہاتھ میں
عارفؔ ظفر وہ ہے کہ سلاطینِ دہر کے — ہے اُس کے در کا حلقہٗ زنجیر ہاتھ میں

(۱۵۵)

دیارِ عشق میں تیرا گزر ہووے تو میں جانوں — اگر سر تک بھی جا کر راہ سر ہووے تو میں جانوں
میرا گریہ بہا دیتا ہے ہر اک بات کو میری — بس ان باتوں سے اُسکے دل میں گھر ہووے تو میں جانوں
خرابی کس کی ہے جو یہ ہمارے دشتِ وحشت ہو — اگر اس بات کا حامی خضر ہووے تو میں جانوں

نہ برہم ہو تو داغِ دل کو میرے دیکھ کر قاتل
تیری شمشیر کے آگے سپر ہووے تو میں جانوں

گزر کر جان سے اپنی قدم رکھ راہِ وحشت میں
اگر پھر عمر بھر تجھ کو خطر ہووے تو میں جانوں

جو تجھ سے ہو سکے سودائے بازارِ محبت کر
دل و جاں تک بھی جانے میں ضرر ہووے تو میں جانوں

کسی تدبیر سے جا گرم کر آؤں اگر عارفؔ
گلی میں اس کے دشمن کا گزر ہووے تو میں جانوں

(۱۵۶)

شہید ہو جو برنگِ حنا وہ کون کہ میں
نہ چاہے اپنا کبھی خوں بہا وہ کون کہ میں

جگر تو ہے گا اُسی کا جو ہے تیرا عاشق
کرے جو نالۂ مثلِ دراں وہ کون کہ میں

قدیم و لائقِ لطف و وفا وہ کون کہ غیر
رفیق و قابل جور و جفا وہ کون کہ میں

مدارِ غمزہ و ناز و ادا وہ کون کہ تو
حریصِ فتنہ و شور و بلا وہ کون کہ میں

اثر ہے دیدۂ تر کا یہ اب تلک باقی
نہ خاک ہو کے بھی عارفؔ اڑا، وہ کون کہ میں

(۱۵۷)

تکلیف آپ آنے کی کیوں آشنا کریں
بیٹھے ہوئے وہیں مرے حق میں دعا کریں

مانا یہ ناصحا کہ نہ اس سے ملا کریں
بہتر تو ہاں یہی ہے مگر دل کو کیا کریں

ہے عاشقوں کو ننگ تمنائے سلطنت
کیوں آرزوئے سایۂ بالِ ہما کریں

افلاک کی ہر آئینۂ ثابت ہو کجروی
حاجت وہ کوئی میری غلط ہی روا کریں

رونے میں گر اثر نہیں اچھا یونہی سہی
اک یہی لطف ہے کہ وہ ہم پر ہنسا کریں

ہم جان جس کو کہتے ہیں تجھ سے مراد ہے
لاویں کہاں سے اور جو تجھ پر فدا کریں

عارفؔ کا حال سب مجھے معلوم ہوگیا
اب اُس کو کچھ نہ کہہ ویں جو میرا کہا کریں

(۱۵۸)

غیروں سے گر وہ ملتے ہیں اچھا ملا کریں
کیا وہ نصیب ہیں جو ہم ان کا گلا کریں

مجھ دل گرفتہ کا کبھو سایہ اگر پڑے
غنچے چمن کے بیچ نہ ہرگز کھلا کریں

اس کی صفائے رخ کے برابر نہ ہو سکے
آئینۂ قمر کو جو برسوں جلا کریں

ہم لاکھ ٹکڑے کرتے ہیں ایک تارِ جیب کے
کہتے نہیں ہیں چاک انھیں جو سلا کریں

عارفؔ جو سر نہ ضعف میں رہ وے تو خوب ہے
اس بوجھ کے اٹھانے کو کب تک ہلا کریں

(۱۵۹)

یہ وہم ہے کہ ہم اس کی کمر کو دیکھتے ہیں
ہم آپ اپنے ہی تارِ نظر کو دیکھتے ہیں

بن اس کے ہے یہ میری جان سے کہیں سونا
خیال کر کے جو ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کریں گے دل کی ہماری وہ قدر کیا دیکھیں
ہم آج ان پہ فدا کر کے سر کو دیکھتے ہیں

تلاش ہے دلِ گم گشتہ کی ہمیں اپنے
بغور یوں جو تری رہ گزر کو دیکھتے ہیں

کبھی نہ نفعِ محبت سے بہرہ ور ہوں گے
جو چاہ کر ہمیں عارف رگڑ کے دیکھتے ہیں

(۱۶۰)

اُس کی ہم پر جو تھی اب چشمِ عنایت ہی نہیں
اور ہی بات ہے کچھ حرف و حکایت ہی نہیں

کوئی بولے کہ نہ بولے یونہی بولے جاؤں
جانتے ہیں اسے سب یہ میری عادت ہی نہیں

گر گماں ہو کہ یہ دل اور کسی کو دیں گے
آپ کا مال ہے اپنے میں خیانت ہی نہیں

چاہتے ہیں تیری الفت سے اٹھاویں دل کو
ناتوانی سے تو اب ہم کو یہ طاقت ہی نہیں

یار کوئے میں جو بیٹھا، یہ ہوا کیا عارف
وہ شرارت وہ اشارت وہ کنایت ہی نہیں

(۱۶۱)

ہر گھڑی چلتی ہے تلوار ترے کوچے میں
روز مر رہتے ہیں دو چار ترے کوچے میں

حال سر کا مرے ظاہر ہے ترے کیا کیجیے
کوئی ثابت بھی ہے دیوار ترے کوچے میں

شکل کو کیونکہ نہ ہر دفعہ بدل کر آؤں
ہیں میری تاک میں اغیار ترے کوچے میں

غم سے بدلی ہے مری شکل تو بے خوف و خطر
دن کو بھی آتے ہیں سو بار ترے کوچے میں

نہ کرے سوئے چمن بھول کے بھی رخ ہرگز
آن کر بلبل گلزار ترے کوچے میں

نرگستان نہ سمجھ کھولی ہوئی آنکھوں کو
ہیں ترے طالبِ دیدار ترے کوچے میں

لائے جب گھر سے تو بے ہوش پڑا تھا عارف
ہو گیا آن کے ہشیار ترے کوچے میں

(۱۶۲)

انھوں سے کرتے ہیں اغیار باتیں
لگیں نہ کیوں یہ مجھ کو خار باتیں

کبھو دے بے خودی اتنی تو فرصت
کہ کرلوں یار سے دو چار باتیں

وہ حالت ہے کہ کر سکتا نہیں ہے
اشاروں سے ترا بیمار باتیں

ترے کوچے میں اے رشکِ مسیحا
کرے ہے صورت دیوار باتیں

بھلا ہم کیا کہیں گے تجھ سے عارفؔ بنا مت باندھ کر، گلنار، باتیں

(۱۶۳)

ہے خیالِ زلف سے بھی اس کے، راحت ان دنوں جانتا ہوں آ گئی ہے میری شامت ان دنوں
اس طرف آنے کی ان کے روز سنتے ہیں خبر رات دن ہووے نہ کیوں خوفِ قیامت ان دنوں
گر بکے ناصح تو سر بھی ضعف سے پھرتا نہیں سلب ایسی ہوگئی ہے غم میں طاقت ان دنوں
عشق کی کم ہوگئی شاید نگاہ مرحمت سر پہ کم آئی ہے میرے کچھ جو آفت ان دنوں
گر پڑی دیوار ان کی عارفِ شوریدہ سر کرتے ہیں ہر اک سے وہ تیری شکایت ان دنوں

(۱۶۴)

بے وفا کیا ہوگیا ہوں فی الحقیقت ان دنوں مجھ سے جو کرنے لگے ہیں وہ محبت ان دنوں
ہاتھ میں سونا اٹھاؤں اپنے، تو ہو جاوے خاک ہوگئی ہے کیا میری برگشتہ قسمت ان دنوں
دیکھ کر کیسے جلے جاتے ہیں دشمن رشک سے گرم ہے ان سے مری از بسکہ صحبت ان دنوں
توبہ کی تھی مے سے لیکن آ گئی فصلِ بہار بس خدا حافظ ہے اے پیرِ طریقت ان دنوں
وہ دعا بھی سن کے اب دیتے ہیں گالیاں ہوگئے عارفؔ سوا وہ بے مروت ان دنوں

(۱۶۵)

خاک کر چکے تو اُسے آہِ شرر بار کہیں چین دیتا ہی نہیں چرخ ستم گار کہیں
شیخ جی محفلِ رنداں میں سمجھ کر آؤ کہ بکھرتی نہ پڑے آپ کی دستار کہیں
تابِ رخ سے ہے تری نور کا عالم سب میں تیرے کوچے میں نہیں سایۂ دیوار کہیں
اس کے کوچے میں نہ کیوں ضبط کروں رونے کو بیٹھ جاوے نہ ابھی یار کی دیوار کہیں
جی لگے ہے نہ بیاباں میں نہ گھر میں عارفؔ چین لیتا ہی نہیں چرخ ستم گار کہیں

(۱۶۶)

جلتا ہوں آہ میں غمِ ہجراں میں رات دن بھڑکے ہے آگ اس دلِ سوزاں میں رات دن
جس دم اٹھاوے عارضِ روشن سے تو نقاب ہوجائے کیوں نہ تیرے شبستاں میں رات دن
جب تک کہ عشق اُن پہ ہمارا کھلا نہ تھا رہتے تھے ہم بھی محفلِ جاناں میں رات دن
کافر کو سچ کہا ہے کہ دنیا بہشت ہے رہتا ہے وہ بھی کوچۂ جاناں میں رات دن
عارفؔ جو ہو سکے تو یہی چاہتا ہے دل اشعار پڑھیے، بزمِ سخن داں میں رات دن

(۱۶۷)

یوں تو کوچے سے ترے ہو کر نکل سکتا نہیں
اور کچھ کیا اپنی صورت میں بدل سکتا نہیں

ساتھ میرے پر میری سی ہو گئی ہے ناتواں
ذکر گر میرا چلاویں وہ بھی چل سکتا نہیں

ناک میں دم آ گیا ہے سخت جانی سے مرا
دم بھی ارماں ہے جو یہ (ہرگز) نکل سکتا نہیں

خاک لوٹے بے قراری سے تیرا بیمارِ غم
ضعف سے دو دو پہر کروٹ بدل سکتا نہیں

ہے شبِ فرقت الٰہی یا کوئی کوہِ سیاہ
میری چھاتی پر سے یہ پتھر تو ٹل سکتا نہیں

تم سے دو باتیں کروں رونے سے فرصت ہو اگر
شدتِ گریہ میں کچھ منہ سے نکل سکتا نہیں

ڈھونڈتا ہے کیا اثر عارفؔ تو اپنی آہ میں
جل گیا ہو جو شجر (اب) وہ تو پھل سکتا نہیں

(۱۶۸)

خیالِ سیم بر ہے اور میں ہوں
بس اب اک گنجِ زر ہے اور میں ہوں

دکھائی جو نہ دیوے لاغری سے
ترا موئے کمر ہے اور میں ہوں

عدو سے کس لیے کرتا تھا باتیں
بھلا اب نامہ بر ہے اور میں ہوں

مجھے کیا کام راہِ کفر و دیں سے
تمھارا سنگِ در ہے اور میں ہوں

سرشکِ چشمِ تر کہتا ہے میرا
کہ عالم میں گُہر ہے اور میں ہوں

تمھارے لب پہ جس کی جان جاوے
جہاں میں اک خضر ہے اور میں ہوں

کیا سب جا کا جانا ترک عارفؔ
بس اب یہ میرا گھر ہے اور میں ہوں

(۱۶۹)

رنگِ حنا سے سرخ ہیں یہ سیم تن کے پاؤں
یا اصل میں ہی ہیں کہیں لعلِ یمن کے پاؤں

کیا بات چل سکے میری اُس کینا کیش پر
یہ بات ہے عیاں کہ نہیں ہیں سخن کے پاؤں

گوشہ نشیں، دشت نوردی (نے) کر دیا
اب ہو گئے ہیں سوج کے ایک ایک من کے پاؤں

گر ہو شریک یہ میری گردش کا ایک دن
تھک جائیں پھرتے پھرتے ہی چرخِ کُہن کے پاؤں

عارفؔ وہ آبِ خضر کو دیکھے نہ پھر کبھو
دھو کر پیے ہوں جس نے حسین و حسن کے پاؤں

(۱۷۰)

کبکِ دری نے ڈالے کبھی طرح بن کے پاؤں
پائے نہ اے پری یہ ترے بانکپن کے پاؤں

بے اختیار چوم لیے عکسِ ماہ نے
لٹکے جو دیکھے حوض میں شب سیم تن کے پاؤں

اب وہ زمین عرشِ معلیٰ سے کم نہیں
جس جس مقام پر کہ پڑے پنجتن کے پاؤں
سو ٹھوکروں سے شیشۂ دل کو خبر نہیں
کس نازکی سے پڑتے ہیں نازک بدن کے پاؤں
عارفؔ جو روزِ حشر میں پوچھیں گے مجھ سے کچھ
میں گر پڑوں گا جا کے حسین وحسن کے پاؤں

(۱۷۱)

خارِ مژہ کو دیکھیے اور گل بدن کے پاؤں
آنکھوں سے کیا ملوں بتِ نازک بدن کے پاؤں
ظاہر ہے ابتری ہمیں اُس طفلِ اشک کی
معلوم پالنے میں ہے اس بدچلن کے پاؤں
زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں وحشت کے زور سے
یارو رہے نہیں مرے قابل رسن کے پاؤں
ہے دل میں آرزو کہ کبھی ہم بھی ہوں ہدف
اٹھتے نہیں ادھر مرے ناوک فگن کے پاؤں
ہے تو بتائے چشمِ ملائک وہ خاکِ پاک
عارفؔ جہاں پڑے ہیں حسین وحسن کے پاؤں

(۱۷۲)

ہم نے دبا کے سُرخ کیے سیم تن کے پاؤں
چاندی کے پاؤں ہو گئے لعلِ یمن کے پاؤں
تیری گلی میں صورتِ نقشِ قدم جمے
اب ہلنے والے یاں سے نہیں خستہ تن کے پاؤں
اس کجروی پہ کاٹ ہی ڈالوں جو دیکھ لوں
آتے نظر نہیں مجھے چرخِ کہن کے پاؤں
زلفِ سیہ کے پیچ سے بس دل نکل چکا
پھندے سے کب نکلتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں
عارفؔ رقم ہو کس سے بھلا ان کا مرثیہ
پہنچے ہیں عرش پر بھی حسین وحسن کے پاؤں

(۱۷۳)

اب ٹھہرتے نہیں مرے اندر وطن کے پاؤں
چھانیں گے خاکِ دشت ہی، دیوانہ پن کے پاؤں
اٹکھیلیوں سے بادِ صبا بھی چلے ہے آج
کچھ اور ہیں ولے ترے مستانہ پن کے پاؤں
اُس کو جگایا ہم نے بٹھا کر تمام رات
یاں تک کہ سو گئے بتِ رشکِ چمن کے پاؤں
ہاتھوں کو میں بھی رشک سے کیا کیا ملا کیا
ناپے جو کفش دوز نے اس سیم تن کے پاؤں
دیکھے گا کوئی حشر میں باغِ بہشت کو
عارفؔ ہمیں تو بس ہیں حسین وحسن کے پاؤں

(۱۷۴)

ردیف: و

وہ خستہ تن کہ چین بھی جس کو کبھو نہ ہو
فرطِ تپش سے چاکِ دل اس کا رفو نہ ہو

چھڑکوں کبھی نہ مشک (بھی) زخمِ جگر پہ میں
اس میں جو تیرے کاکلِ مشکیں کی بو نہ ہو
ہاں کچھ نہ کچھ تو ہو مرے جامِ مراد میں
خونِ جگر ہی ہو جو مے مشکِ بو نہ ہو
میں جانتا ہوں غیر سے جو اختلاط ہے
اتنا تو پاس کر کہ میرے روبرو نہ ہو
معلوم ہوگیا نہ کبھی ہوں گے نرم گو
جب تک کہ اُن سے ہم سے کڑی گفتگو نہ ہو
زلفوں کا پیچ کچھ تو کبھی رخ پہ چھوڑ دے
معلوم گو کہ حال ہمیں ہو بہ ہو نہ ہو
عارف یقین جان یہ دھوکا ہے سر بسر
محوِ طلسم ہستیِ فانی کبھی نہ ہو

(۱۷۵)

خوش ایسے ویسے رونے سے اے دل کبھو نہ ہو
جب تک کہ جوشِ موجۂ خوں تا گلو نہ ہو
جل جائیں ہاتھ سر پہ نہ ہو غم سے گر ترے
گل جاویں پاؤں تیری اگر جستجو نہ ہو
دیکھیں جو میرے حالِ پریشاں کو آ کے لوگ
میرے سوا کسو کو تیری آرزو نہ ہو
جب تک میں خونِ رو کے غازی نہ منہ کروں (کذا)
کامل تمھارے سجدۂ در کا وضو نہ ہو
عارف یہ چاکِ دل کوئی پاتا ہے التیام
تارِ نگاہِ یار سے جب تک رفو نہ ہو

(۱۷۶)

سب سے بہتر ہے کہ مجھ پر مہرباں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو
لال مت سمجھ زبانِ شمع کو خامُش ہے یہ
بات پھر کس سے کرے جب ہم زباں کوئی نہ ہو
مریے اس حسرت میں گر قاتل نہ ہاتھ آوے کہیں
روییے اپنے پہ خود گر نوحہ خواں کوئی نہ ہو
بیچ میں ہے میرے اُس کے تو ہی اے آہِ حزیں
صلح کیونکر ہووے جب تک درمیاں کوئی نہ ہو
شکوہ کس سے کیجیے خالق کی مرضی ہے یہی
نکتہ چیں پیدا ہوں لاکھوں نکتہ داں کوئی نہ ہو
مجھ تلک قاتل تو قاتل موت بھی آتی نہیں
کس کو دیجے جان جب خواہانِ جاں کوئی نہ ہو
مانے گر کوئی نصیحت عارفِ دل خستہ کی
بھول کر بھی والۂ آتش رنجاں کوئی نہ ہو

(۱۷۷)

ہم نشیں آزار ہی سے مجھ کو راحت ہو تو ہو
ٹپکے ہے زہر آنکھ سے اب زہر امرت ہو تو ہو
حال اب باقی نہیں ہے اس تیرے بیمار میں
نبض ہی میں تھوڑی سی گر کچھ حرارت ہو تو ہو
بوالہوس ہیں سب کے سب تو ان کے نالوں پر نہ جا
اس ستم سہنے کی ایک مجھ کو ہی عادت ہو تو ہو
ایک بگولا سا جو جنگل سے اٹھا ہے اے خضر
خاک عارف کی یہی حضرت سلامت ہو تو ہو

شیخ دکھلادے برہمن کی طرح معبود کو　　جب تو البتہ ہمیں بخشے ارادت ہو تو ہو

(۱۷۸)

خوف سے میرے بدن میں خوں نہ کیونکر خشک ہو　　گرمیٔ خوں سے میرے گر آپ خنجر خشک ہو
سارے عالم میں تری مشہور ہے دریا دلی　　اور مری کشتِ امل اے دیدہ تر خشک ہو
آتشِ دوزخ بھی سیرابی سے اس کی بجھ گئی　　اب کہاں جاؤں کہ میرا دامنِ تر خشک ہو
عرصۂ محشر میں (لیکر) تشنہ دل جاتا تو ہوں　　پر کہیں ایسا نہ ہووے حوضِ کوثر خشک ہو
رات دن روتا ہوں میں عارف فراقِ یار میں　　کس طرح پھر یہ مرا بالین و بستر خشک ہو

(۱۷۹)

صاف رکھا چاہیئے، ہے ابروئے خمدار کو　　ڈال کر بل، مت لگاؤ عیب، تم تلوار کو
آفریں صد آفریں اس آہ آتش بار کو　　کردیا فی النار دم میں خانۂ اغیار کو
کعبہ میں جانے سے حاصل گر نہ ہو چشم یقین　　کیا کرے گا دیکھ کر زاہد در و دیوار کو
مشکل آساں اُس کی اب جلدی سے کردیوے خدا　　کیا دعا اُس کے سوا دیجیے ترے بیمار کو
طور کو برقِ تجلی نے جلایا شک نہیں　　رنج تک لیکن نہ پہنچا طالبِ دیدار کو
اس زمیں پہ میری آنکھیں خود بہ خود بچھنے لگیں　　اس پتے سے میں نے جانا رہگزارِ تار کو
منہدم گھر بنتے ہی بنتے ہمارا ہوگیا　　آنکھ سے عارف نہ دیکھا سایۂ دیوار کو

(۱۸۰)

الفت میں پھنسے ہیں تری ہم آکے ابھی تو　　بے داد نہ کر ہم پہ تو گھبرا کے ابھی تو
کھل جائے گا ان کی نگہہ تیر کا عالم؟　　وہ آنکھ اٹھاتے نہیں شرما کے ابھی تو
کہتے ہیں قیامت اُسے اس چھوٹے سے سن پر　　ہوتا ہے برابر کہیں 'طوبیٰ' کے ابھی تو
اپنے ہی میں دل میرا ہوا پھر یہ کدھر گم　　لایا تھا تری راہ سے میں پاکے ابھی تو
وہ اشک نکلتے ہیں کہ گھبرا گئے عارف　　ایک لاکھ برس روئیے چلاکے ابھی تو

(۱۸۱)

کہتے ہو کن سے تم گہر آب دار دو　　ہم مستعد ہیں رونے پہ دامن پسار دو

اوپر کی پانچ غزلیں (غزل ۱۸۱-۱۷۷) غالب کی زمین میں ہیں اور اہلِ بیت سے گہری عقیدت کا اظہار خاص طور پر مقطعوں میں نظر آتا ہے۔

ہے موشگاف قاتلِ بے باک شک نہیں
شمشیر سے کیا، جو مرا جسم زار، دو

جاگے گا ایک شام سے کس طرح صبح تک
درکار مجھ غریب کو ہیں غم گسار دو

صیاد ناز و غمزہ تو دو، مرغِ دل ہے ایک
لاؤں کہاں سے ان کے لیے میں شکار دو

عارفؔ کے ہیں قلم سے سخن دانِ نکتہ سنج
کہتے ہو کن سے تم گوہرِ آبدار دو

(۱۸۲)

ہم پوچھتے ہیں ناحق، ہر اک سے اُس کے گھر کو
جاویں نہ کیوں اُدھر کو لے جائے دل جدھر کو

شغلوں میں بہر عزت ہرگز نہ ہم ملیں گے
گو ہم سے ہو عداوت اُس چرخِ کینہ ور کو

ان کا نہ دیکھنا بھی ہے عین مہربانی
وہ روکتے ہیں یعنی برچھی سی اُس نظر کو

حیران ہیں کہ اب کیا فکرِ معاش کیجیے
ہاں اب تو ایک مدت کھایا کیجیے جگر کو

بھرنے نہ دیجو اس میں ہرگز ہوائے ساماں
رکھا ہے گر جہاں میں عارفؔ عزیز سر کو

(۱۸۳)

غرورِ حسن ہے اب تو دو چند اس آفتِ جاں کو
دکھایا کس لیے میں نے شبیہِ ماہِ کنعاں کو

نہیں کچھ دور اوجِ طالعِ وحشت کے رُتبے سے
کہ سیویں حضرتِ عیسیٰ مرے چاکِ گریباں کو

یہ کُنجِ گور کی ظلمت شبِ مہتاب ہے گویا
کہ دیکھا ہے ان آنکھوں سے شبِ تاریک ہجراں کو

ٹھکانا ہے کہیں اتنی بھی ان کی بدگمانی کا
وہ مری خاک سے گزرے اٹھا کر اپنے داماں کو

میری جانب کوئی وہ ملتفت ہوتا ہے اے عارفؔ
غرورِ حسن ہے اب تو دو چند اُس آفتِ جاں کا

(۱۸۴)

ردیف:(ہ)

کچھ اور نہیں، فائدہ (اس) غم سے زیادہ
کب دیر لگی ہونے اِسی کم سے زیادہ

ناحق شبِ مہتاب میں دریا پہ سجادا (کذا)
کیا ہے وہ میرے دیدۂ پُرنم سے زیادہ

کیا کوہکن و وامق و مجنوں کا ہے شُہرہ
وحشت میں نہ تھا ان میں کوئی ہم سے زیادہ

رونق پہ نہ کیوں داغِ جگر اشکوں سے ہوویں
گُل تازہ ہوا کرتے ہیں شبنم سے زیادہ

کیا شہرِ محبت کا بیاں کیجیے عارفؔ
خوش کوئی نہیں یاں دلِ پُرنم سے زیادہ

(۱۸۵)

قصۂ کوہکن سے تو (قصہ) بُرا نہ یہ نہ ہو
لیکن سمجھ کے میرا حال اُس نے سنا نہ یہ نہ وہ

شمس و قمر کو کیا فروغ آگے جمالِ یار کے
اُس کی طرف سے ہے گلا ہوش رُبا نہ یہ نہ وہ

کوہِ غم اور یہ سر بُرا دونوں دھرے ہی رہ گئے
رنج و ملال ضعف میں ہم سے اٹھا نہ یہ نہ وہ

خونِ دل و جگر دریغ آنکھوں نے سب بہا دیا
یونہی پیاسے مر گئے ہم نے پیا نہ یہ نہ وہ

عارف یا وہ گو خموش طرز یہ کیا ہے شعر کی
اس میں ردیف و قافیہ ہے گا بھلا نہ یہ نہ وہ

(۱۸۶)

کس طرح دیکھ سکوں صبح تلک یار کی راہ
دم نکل جانے کو ہے، دیدۂ بیدار کی راہ

ایک دن کہہ کے، جو یوسف، اُنھیں چھیڑا میں نے
وہ گزرتے نہیں اُس روز سے بازار کی راہ

اب تو جاتا نہیں میں چشمۂ حیواں کو خضر
یوں تو ہے دیکھی ہوئی وہ مری وہ سو بار کی راہ

ہے جو راحت طلبی سے مرے یار کو نفرت
دل سے بھاتی ہے مجھے وادیِ پُر خار کی راہ

پا سکے کون کہ ہیں پیچ ہزاروں عارف
کس کو آتی ہے مری بندشِ اشعار کی راہ

(۱۸۷)

ردیف (ھ)

وفاداری نہ میری یار سے پوچھ
یہ اُس کے سایۂ دیوار سے پوچھ

لہو بھی زندگی سے تلخ تر تھا
تو اپنی تیغِ جوہردار سے پوچھ

میری صحرا نوردی کی حقیقت
زباں رکھتا تو ہے ہر خار سے پوچھ

منجّم حال کیا جانے فلک کا
ہماری آہِ آتش بار سے پوچھ

کہو کیا ہے تمھارا حال عارف
کسی دن تو ذرا یوں پیار سے پوچھ

(۱۸۸)

کافر کو ہے خلاف یہ بس اہلِ دین کے ساتھ
زلفیں الجھ پڑیں (نہ) رخِ نازنیں کے ساتھ

تاثیرِ جذبِ عشق سے میرے عجب نہیں
اٹھ آئے سنگِ در، جو تمھارا جبیں کے ساتھ

غزل 185 کا مقطع اس دورِ شعر گوئی کے لیے ایک کلیدی اندازِ فکر رکھتا ہے، اس دور کے اکثر شعرا اور اساتذہ جذبات نگاری اور اپنی تخلیقی حسیت کے اظہار کے لیے شعر نہیں کہتے تھے بلکہ شاعری میں اپنی زبان دانی، محاورے پر قدرت اور ردیف و قافیے کی استادانہ نشست پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ عارف نے بھی اپنی شاعری کے لیے ردیف و قافیہ اور ان کی استادانہ نشست ہی کو پیش نظر رکھا۔ یہاں بھی انھوں نے یہ کہا ہے کہ اشعار کا سیدھا سادا ہونا کافی نہیں ہے، اس میں خیال آرائی، مضمون آفرینی اور معنی بندی بھی ہونی چاہیے۔

ہم راز دارِ عشق ہیں ساکت ہیں اس لیے
کب ہم کلام ہوتے ہیں روح الامیں کے ساتھ
طالب ہوں میں، جو سایہ دیوار کا تری
ہے قصہ ہمسری مجھے عرشِ بریں کے ساتھ
عارفؔ شبِ فراق میں اپنا وہ حال ہے
روتے ہیں مدعی بھی مرے، ہم نشیں کے ساتھ

(۱۸۹)

ہشیار ہو کے رکھیو قدم راہبر کے ساتھ
ناکام رہ گیا ہے سکندر خضر کے ساتھ
غم نے کیا ہے وہ ترے خستہ جگر کے ساتھ
کرتا ہے جو سلوک کہ پانی شکر کے ساتھ
تھے وہ بھی دن کبھی کہ تجھے جھانکتے تھے ہم
آنکھیں لگا کے روزنِ دیوار و در کے ساتھ
نفرت ہوئی ہے وہ تری بک بک سے ناصحا
پھرنے لگا ہے جی بھی مرا اب تو سر کے ساتھ
عارفؔ نہ کچھ کبھی حاصل کوئی کمال
ہے دشمنی زمانے کو اہلِ ہنر کے ساتھ

(۱۹۰)

ردیف: ی

ہے عیاں تاثیر ہردم طالعِ منحوس کی
عطر بھی ملیے تو صورت ہے کفِ افسوس کی
فرش تیری راہ ہونے کی ہے ان آنکھوں کی چاہ
ہے لبوں کو آرزو از بس تیرے پاپوش کی
زاہدانہ کر کے اُس کو حلقۂ رنداں میں آ
دھجیاں اُڑ جائیں گی اس خرقۂ سالوس کی
یہ کُرہ سے ہے ہوا کے سینکڑوں درجے بلند
بری شمعِ آہ کو حاجت نہیں فانوس کی
شادی و غم میں نہیں عارف ہمیں کچھ امتیاز
عطر بھی ملیے تو صورت ہے کفِ افسوس کی

(۱۹۱)

وفورِ گریہ سے ہے آہِ نارسا ٹھنڈی
کہ قاعدہ ہے برسنے میں ہو، ہوا ٹھنڈی
نہ کھاؤں کیونکہ غم سرد مہریِ خوباں
کہ چاہیے ہے بہت عشق میں غذا ٹھنڈی
ابھی نہ کھا کہ اثر سوزِ غم کا ہے باقی
ذرا تو ہونے دے یہ ہڈیاں ہما ٹھنڈی
ہماری خاک سے کحل الجواہر اے صیاد
لگا کے ہووے تری چشم سرمہ سا ٹھنڈی
نکال زور سے اشعارِ گرم اے عارفؔ
مگر زمیں ہے یہ انصاف کر ذرا ٹھنڈی

(۱۹۲)

یاں تو اسے اب دم کی بھی مہلت نہیں ملتی
واں اُس کو ذرا آنے کی فرصت نہیں ملتی

آتے ہیں صدا انجمنِ یار سے بے حظ — عزت کا تو کیا ذکر ہے ذلت نہیں ملتی
وہ ہم ہیں کہ رکھتے ہیں ہزاروں درمِ داغ — ہر ایک کو یہ عشق کی دولت نہیں ملتی
آخر تو ترے دام میں ہے سارا زمانہ — کیوں سیر چمن کی مجھے رخصت نہیں ملتی
کھولیں کسی صورت سے طلسمِ دلِ جاناں — عارفؔ کوئی ایسی ہمیں حکمت نہیں ملتی

(۱۹۳)

سوبار جسے عشق میں ذلت نہیں ملتی — اربابِ وفا میں اُسے عزت نہیں ملتی
بے فیض نہ جا انجمنِ بادہ کشاں سے — اے خضر ادھر آ کہ یہ صحبت نہیں ملتی
فرہاد سے کچھ کم نہیں میں کوہ کنی میں — پھرتا ہوں بہت پر کہیں محبت نہیں ملتی
کب سن کے دعا وہ مجھے گالی نہیں دیتے — ہر نذر پہ کب اک مجھے خلقت نہیں ملتی
جو دم ہے سو پھر یادِ صنم میں اسے عارفؔ — نادان غنیمت ہے یہ صحبت نہیں ملتی

(۱۹۴)

ہمیشہ شرم گنہ سے جو ہووے تو پانی — وہ (تو) دوجہاں میں رکھے جری آبرو پانی
گدازِ غم میں مرا حال کیا کیا مت پوچھ — مشابہ اُس کے ادب سے ہو، ہو بہو پانی
یہ بختِ خُفتہ نہ بیدار جب سے ہو، منہ پر — جو اس کے چھڑکے (ہے) بھر بھر کے سو سبو پانی
نہ گرمِ جنگ ہو اتنا کہ تیغِ جوہر دار — نہ کھل کے ہووے کہیں تُرکِ جنگجو پانی
ملے سرشک میں کس رنگ خونِ دل عارفؔ — نہ جب تلک کہ کروں ایک میں لہو پانی

(۱۹۵)

گریہ سے ہے عاشقِ دلگیر پانی کی بنی — حال دل کا کیا کرے تقریر پانی کی بنی
حوض میں وہ عکس اپنا دیکھ کر کہنے لگے — کس نے رکھی ہے مری تصویر پانی کی بنی
روز موتی صدقے کرنے کو کہاں سے لاؤں میں — خشک ہے کہیں صاحب مری جاگیر پانی کی بنی
ابرِ تر، سر پر کھڑا ہے اور میری کشتِ امید — خشک رہ وے وائے رے تقدیر پانی کی بنی
بام پر میں بیٹھ کر روتا ہوں عارفؔ دیکھ لے — تو نے گر دیکھی نہ ہو تعمیر پانی کی بنی

(۱۹۶)

تھی نہ آسان مری بات تو اصلاً، پانی — کردیا میں نے غوامض کو سراپا پانی

خوگرِ میکدہ کو چشمۂ حیواں نہ دکھا
اے خضر وہ تو مرے حق میں ہے کالا پانی
افعی زلفِ سیہ کو تری دیکھا جس نے
یہی دیکھا ہے کہ پھر اس نے نہ مانگا پانی
آبِ شمشیر سے لاچار ہوں ورنہ مجھ کو
قتل اُس جا پہ کرو ہووے نہ جس جا پانی
تشنگی آبِ گہر سے نہیں بجھتی عارفؔ
عقل حیراں ہے مری اس میں ہے کیسا پانی

(۱۹۷)

آہ کو جو کہوں بُرائی کی
بخت نے کون سی رسائی کی
مہرباں وہ ہوئے تو حیراں ہوں
اُن سے کیا میں نے بے وفائی کی
اس کے رفعِ گمانِ بد کے لیے
مدتوں ہم نے پارسائی کی
ضعف میں سر ہلا نہ بالیں سے
گو بہت طاقت آزمائی کی
سب سے بیگانہ ہم رہے عارفؔ
دوستی کی نہ آشنائی کی

(۱۹۸)

پھر نہ پایا سنگِ در جب واں رسائی ہوگئی
ختم اپنے سر کے اوپر جبہ سائی ہوگئی
باغ سے آتی ہیں کاشانے میں مرے بلبلیں
کیا بری مشہور واں بھی خوشنوائی ہوگئی
تو ہی کر انصاف یارب ہم کسے سجدہ کریں
جب بتوں کے حکم میں ساری خدائی ہوگئی
خلق سے حاصل ہمیں غربت میں ہے لطفِ سخن
جتنے بیگانے تھے سب سے آشنائی ہوگئی
کچھ نظر آتے ہو عارفؔ تم ہمیں دلگیر سے
آج کیا اُس جنگجو سے پھر لڑائی ہوگئی

(۱۹۹)

لُٹ کے گھر، آہوں (سے) ہے آج ہمارا خالی
نہیں کچھ بعید سے یہ آپ کا آنا خالی
شکر اللہ کا کہ ممنونِ فلک میں نہ ہوا
عمر بھر میری رہی جیبِ تمنا خالی
باندھ کر تیغ زمیں پر نہیں رکھتے وہ قدم
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ ہو عالم (بالا) خالی
منزلِ عشق کی رہ میں، جو کیا میں نے قیام
میرے رہنے کو ہوا عرشِ معلیٰ خالی
میر و مرزا بھی کہیں آج ہیں عارفؔ موجود
جان لو اہلِ ہنر سے نہیں دنیا خالی

(۲۰۰)

جس دم کہ سوزِ عشق کی مجھ کو ہوا لگی
بھڑکی وہ دل میں آگ کہ گھر گھر کو جا لگی
اس رنگ سے جو چاک گلوں کا جگر ہوا
کیا آن تری بلبل خونیں نوا لگی

تھوڑی سی پڑ گئی جو ترے تفتہ جاں کی خاک — دامن کو اپنے جھاڑنے بادِ صبا لگی
ہے اب تو راہِ عشق میں اک فوج میرے ساتھ — ہر ہر قدم پہ جو میری نبچتے بلا لگی
جواب ہے تمھی سدا سے یہی وضع آپ کی — دنیا کی بار سے تم کو بھی عارف ہوا لگی

(۲۰۱)

ان کی اور میری کسی روز لڑائی نہ گئی — بات بگڑی ہے کچھ ایسی کہ بنائی نہ گئی
ہم نے ہر چند مَلا ان کو بہت روغنِ قاز — پر کسی شکل ذرا ان کی روکھائی نہ گئی
کیوں نہ کھا تا جرے ملنے کی قسم ہو کے بہ تنگ — تھی مگر زہر سے بھی تلخ کہ کھائی نہ گئی
اس قدر ضعف میں آواز نکلتی تو کہاں — ہم سے زنجیر درِ یار ہلائی نہ گئی
اس کے دیدار سے محروم نزاکت نے رکھا — دونوں ہاتھوں سے نقاب اس سے اٹھائی نہ گئی
گریۂ چشم نے سو بار اٹھایا طوفاں — پر ذرا آتشِ دل میری بجھائی نہ گئی
مر گئے پھر بھی وہ مضطر ہے مرا دل عارف — خاک میں لاش کسی طور دبائی نہ گئی

(۲۰۲)

نہیں ہرگز یہ جان جانے کی — راہ دیکھے ہے ترے آنے کی
نسخۂ عشق کے مطالعہ سے — کس کو فرصت ہے سر اٹھانے کی
کعبۂ دل کو ڈھا (تو) مت ظالم — نہیں توفیق گر بنانے کی
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ سانس بھرتے ہیں — یہ بھی ایک طرز ہے جلانے کی
خضرِ صحرائے عشق ہوں عارف — مجھ کو خدمت ہے رہ بتانے کی

(۲۰۳)

آنکھ کیوں تو نے ہم سے صاف نہ کی — تھی وہ کیا جو خطا معاف نہ کی
دل تو دل ایک ذرا دکھا ہم کو — آنکھ بھی اس نے ہم سے صاف نہ کی
عمر بھر میں بجز وفا کے کبھی — بات کوئی تیرے خلاف نہ کی
فکرِ عنقا ہی میں رہا ناداں — اک ذرا سیر کوہِ قاف نہ کی

عارف اگر چہ اثنا عشری عقائد نہیں رکھتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالب کی طرح اہلِ بیت سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے، انھوں نے حسین اور حسن کے قافیے کے ساتھ پانچ غزلیں لکھیں اور غزل 202 کے مقطعے سے بھی ان کی اس عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

وصفِ موئے کمر رہا عارفؔ   فکر کچھ تو نے موشگاف نہ کی

(۲۰۴)

تدبیر میں یارو نہیں تقصیر تمھاری   تقدیر میری ہوگئی تدبیر تمھاری
کیا مر گئے زنداں میں اسیرانِ محبت   آواز نہیں دیتی ہے زنجیر تمھاری
تم آن کے سمجھاؤ مرے دل کو تو شاید   کر جائے نصیحت کوئی تاثیر تمھاری
رہتی ہے پریشاں جو سراسر یہ ہمیشہ   کس پیچ میں ہے زلفِ گرہ گیر تمھاری
جب دادِ سخن ملتی تمھیں حضرتِ عارفؔ   سنتا جو غزل آج کو یہ میرؔ تمھاری

(۲۰۵)

بزمِ جاناں کی نہ پہلی سی وہ رنگت پائی   اور ہی لوگ ہیں کچھ اور ہی صحبت پائی
دعویٔ عشق بھی بس آج سے چھوڑا ہم نے   تیرے دل میں نہ ذرا اپنی محبت پائی
شکوہ ہے تجھ سے عبث جتنے ہیں عالم میں حسیں   بے مروّت ہیں سبھی کس میں مروّت پائی
خوب دل کھول کر روتا میں لپٹ کر اس سے   پر کہیں قیس کی صحرا میں نہ تُربت پائی
اس زمیں (میں) یہ غزل ہم نے لکھی اے عارفؔ   باوجودے کہ طبیعت میں نہ جودت پائی

(۲۰۶)

بے اثر آہ کو پایا تو کمر ٹوٹ گئی   اُس ملنے کی ترے رشکِ قمر ٹوٹ گئی
دمِ تقریر میرے منہ سے جھڑے ہیں موتی   یا گلے کی یہ ترے سلکِ گہر ٹوٹ گئی
ہوگیا دامنِ بادِ سحری عطر آگیں   مشیمۂ غنچے کی جو ہنگامِ سحر ٹوٹ گئی
دیر ساقی نے جو کی ساغرِ مے دینے میں   مے کی ٹھلیا میری لگتے ہی نظر ٹوٹ گئی
صبح عارفؔ نے جو گلشن میں غزل خوانی کی   بارِ مرغاں سے ہر ایک شاخِ شجر ٹوٹ گئی

(۲۰۷)

روئے جا چشمِ دجلہ بار ابھی   دلِ جاناں میں ہے غبار ابھی
وقفِ سر ہاتھ کیا کروں غم میں   جیب کرنا ہے تار تار ابھی
کانٹے کھاتا ہے گھر ابھی سے ہمیں   دور ہے موسمِ بہار ابھی
روک رکھا ہے گریہ کو ورنہ   بند ہو تیرا رہ گزار ابھی
غمِ دل خواہ کیا نہیں عارفؔ   نہیں دل کو جو کچھ قرار ابھی

(۲۰۸)

تر جو اے چشم تو نہ ہووے گی جب تلک آبرو نہ ہووے گی
اس کو گل ہی کبھو نہ کہویں گے جس میں کچھ تیری بو نہ ہووے گی
جس کو سن کر کوئی نہ ہو بے خود وہ تیری گفتگو نہ ہووے گی
جو کہ بر آتی ہو جہاں میں کبھو وہ میری آرزو نہ ہووے گی
خوار ہوں گے نہ ہم اگر عارفؔ جب تلک آبرو نہ ہووے گی

(۲۰۹)

سر جو رہتا ہے میرا رونے سے اکثر بھاری پاؤں پر رکھتا نہیں ان کے سمجھ کر بھاری
بے تکلف حرکت کچھ جو فلک کرتا ہے آج کل مجھ پہ ستارہ ہے مقرر بھاری
غیر کے سامنے یوں مجھ پہ یکا یک نہ اُٹھے دستِ نازک میں تیرے کاش ہو زیور بھاری
اور کچھ ہیں جرے دل بند کے تیور بہ خدا آج کی رات ہر اک بت کو ہے آذر بھاری
اپنے گھر میں ہے مجھے روز مصیبت عارفؔ تین دن گور میں ہوتے ہیں مقرر بھاری

(۲۱۰)

ردیف (ے)

کب بیاں کرنا ہے لائق سوزِ پنہانی مجھے شمع ساں اپنی زبان لازم ہے کٹوانی مجھے
وہ ملا ہے تندخو محبوب لاثانی مجھے جن کی کوئی بات بھی مشکل ہے دہرانی مجھے
رشک کیا کیا مجھ پہ ہے رضواں کو جب سے چرخ نے اس شہِ خوباں کے در کی دی ہے دربانی مجھے
کیوں نہ ہو جاؤں بسانِ جادہ اب پامال میں رہروانِ عشق کو ہے راہ بتلانی مجھے
محو ہو جاتے ہیں سب، پڑھتا ہوں جب عارفؔ غزل کیوں نہ کہویں بلبل باغ سخن دانی مجھے

(۲۱۱)

غلط ہے یوسفِ گم گشتہ اب وطن سے ملے اگر ملے تو اُسی کے چہِ ذقن سے ملے
پڑا ہے کاشا کوہِ غم فراق ہمیں ملے وہ ہم سے تو شیریں بھی کوہکن سے ملے
یقیں ہے لاش بھی بھاگے مری وہ وحشی ہوں اگر ذرا بھی بدن جامۂ کفن سے ملے
ہجوم کیوں نہ کریں تیرے رخ پہ پروانے مزا نہ جلنے کا جب شمعِ انجمن سے ملے
حریم دل ہی میں موجود وہ تو ہے عارفؔ یہ کس کے واسطے ہم شیخ و برہمن سے ملے

(۲۱۲)

ڈر لگے کیونکر نہ ایسے فتنہ گر کی آنکھ سے
سُرمہ لے جائے چُرا کر جو شرر کی آنکھ سے

ہے تصور اس کو ہر دم جو ہمارے قتل کا
خوں ٹپکتا ہے بتِ بے دادگر کی آنکھ سے

باغ میں روئے بہت ہم نرگسِ شہلا کو دیکھ
یعنی ملتی ہے یہ کچھ اس سیم بر کی آنکھ سے

سننے کو ہر ایک یوں کانوں سے تو سنتے رہے
پر حقیقت کچھ نہ دیکھی، اُس کمر کی، آنکھ سے

یاد عارفؔ کیا نہیں پہلی تجھے رسوائیاں
پھر لڑائی آنکھ جو اُس کینہ ور کی آنکھ سے

(۲۱۳)

آگیا وہ رخ جو ہنگامِ سحر کھولے ہوئے
رہ گئے گلشن میں (کیا) گلہائے تر کھولے ہوئے

وہ سراپا صورتِ غم ہوں کہ جس کے حال پر
شامِ غربت بیٹھتی ہے موئے سر کھولے ہوئے

خوف کیا خورشید محشر کا ہے، اس کا غم کرو
آئیں گے جس وقت ہم، داغِ جگر کھولے ہوئے

جی میں تھا دل کھول کر روئیں گے (ہم) اُس کے بِنا
رہ گئے پر نرگسِ آسا، چشمِ تر کھولے ہوئے

وصل کی شب لگ گئی عارفؔ ہماری بددعا
رہ گئے منقار مرغانِ سحر کھولے ہوئے

(۲۱۴)

ہیں ہم بھی خوب چاہ کا ساماں کیے ہوئے
بیٹھے ہیں گھر کو پہلے ہی ویراں کیے ہوئے

دھوکے میں آ کے باغِ جہاں میں چلے گئے
دل میں گمانِ کوچۂ جاناں کیے ہوئے

بیٹھا ہوں روزِ ہجر میں ہر اک گھڑی پہ میں
عزمِ شمارِ ریگِ بیاباں کیے ہوئے

پاس ان کو رہ دے اپنے (ہی) ناموس و ننگ کا
ہم بھی پھریں گے چاک گریباں کیے ہوئے

عارفؔ بتا کہ سر ہے یہ کس دن کے واسطے
پھرتا ہے آج تیغ وہ عریاں لیے ہوئے

(۲۱۵)

مر کے بھی ہم ساتھ اک خیل و حشم لے جائیں گے
حسرتیں لے جائیں گے درد و الم لے جائیں گے

تاجرِ شہرِ محبت ہم ہیں مصرِ حسن میں
جنسِ دل لائے تھے وھاں سے یہاں سے غم لے جائیں گے

رہ گزر پر اپنی ہم کو بیٹھنے، اچھا نہ دو
روز آ کر بوسۂ نقشِ قدم لے جائیں گے

آن بیٹھے اک ذرا در پر تیرے تو کیا (ہوا)
کیوں خفا ہوتا ہے اک ساعت تو دم لے جائیں گے

دم نکل جانے دے عارفؔ کا گلی میں اپنی تو
پھر اٹھا کر ہم ترے سر کی قسم لے جائیں گے

(۲۱۶)

جو آپ دے درم وہ نہیں کم نعیم سے
از خود گرے ہے جنس تو دستِ کریم سے

آدم، نہ میں تو منہ کبھی کرتا پھر اُس طرف
گر یوں نکالتے مجھے باغِ نعیم سے

یارت خطا جو یوں مرے قاتل کی بخش دی
ہوں بدگمان اِس تیرے لطفِ امین سے

مجھ سے غمی کو فائدہ کیا ہے نشاط سے
میں ہوں وہ گل کہ غنچہ ہوا اُٹھا نسیم سے

عارفؔ گدازِ غم سے ہوئے جب کہ آب ہم
بیٹھے ہیں ہاتھ دھو کے یہ امید و بیم سے

(۲۱۷)

مر جائیں گے لیکن کبھی الفت نہ کریں گے
ہم جینے کو اپنے یہ مصیبت نہ کریں گے

ہے دل میں کہ مل جایئے اب بوالہوسوں میں
پھر ہم سے کہاں تک وہ مروت نہ کریں گے

کہتے ہیں مری جان کا جانا نہیں ممکن
جب تک وہ مجھے آپ سے رخصت نہ کریں گے

اے خضر جو پینا ہو ہمیں آبِ بقا بھی
اس پھرنے سے میخانہ کی خدمت نہ کریں گے

تو اب تو گریباں کو مرے چھوڑ دے عارفؔ
بس آج سے ہم تجھ کو نصیحت نہ کریں گے

(۲۱۸)

دیکھ وہ زلفِ دوتا لینے کے دینے پڑ گئے
سر پہ جب آئی بلا لینے کے دینے پڑ گئے

مول لیتا یک طرف یاں خود زلیخا بک گئی
سُن کے آوازِ دِرا لینے کے دینے پڑ گئے

زہر ہوتی ہے وہ حق میں اُس مریضِ عشق کے
جب پلائی کچھ دوا لینے کے دینے پڑ گئے

مانگتا تھا بوسہ ان سے لے گئے وہ جان و دل
کیا کہوں یہ ماجرا لینے کے دینے پڑ گئے

انتہائے عشق عارفؔ کس نے دیکھی ہے بھلا
دیکھتے ہی ابتدا لینے کے دینے پڑ گئے

(۲۱۹)

بالیں میں اگر اُس کی تو گفتار میں آوے
جاں از سرِ نو پھر ترے بیمار میں آوے

غزل 218 کے چوتھے شعر میں مخطوطے میں ''پیراہنی'' ہے۔

غزل 220 کے مقطعے میں ''صاحب لولاک'' آیا ہے، یہ حضور اکرم کی ذاتِ والا کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس کی بنیاد وہ حدیث قدسی ہے جس کے الفاظ ہیں'' لولا لما خلقت الافلاک ''۔اے محمد اگر میں تمھیں پیدا نہ کرتا تو افلاک کو بھی پیدا نہ کرتا۔

میں مدت سے کم تیرے تصور میں نہ جانوں　　گر خواب میرے دیدۂ بیدار میں آوے
کیونکر کوئی پھر تجھ سے نہ آزار طلب ہو　　راحت کا مزہ جب ترے آزار میں آوے
اس گھاٹ سے دل کا اُسے منظور تھا لینا　　اب کس لیے آغوشِ طلب گار میں آوے
عارفؔ یہی کافی ہے بنا یار کے گھر کی　　راحت تجھے جس سایۂ دیوار میں آوے

(۲۲۰)

وہ رشکِ چمن صبح، جو گلزار میں آوے　　گلِ نذر کو بلبل لیے منقار میں آوے
بے شبہ اُسے تو مری قسمت کا سمجھ لے　　جو پیچ ترے کاکلِ خمدار میں آوے
مشہور ہے موسیٰ یدِ بیضا کا ترے نور　　معلوم ہو گر میری شب تار میں آوے
کیوں پرتوِ خورشید سے ہوننگ نہ اُس کو　　جو ذرہ ترے روزنِ دیوار میں آوے
خورشیدِ قیامت کا اُسے ڈر نہیں عارفؔ　　جو سایۂ عباس علمدار میں آوے

(۲۲۱)

لاکھ دم مہ پیکری کا ماہِ کنعانی بھرے　　پر تجھے دیکھے تو تیرے سامنے پانی بھرے
دلِ فگاروں کا تیرے شورِ تبسم ہے علاج　　یہ وہ مرہم ہے کہ اس سے زخمِ پنہانی بھرے
یہ گُل رخسار اور بلبل! خدا کی شان ہے　　دم تمھارے عشق کا مرغِ گلستانی بھرے
اب ہماری بات بھی سننے سے وہ معذور ہیں　　کان کیوں غیروں کی جانب سے یہ نادانی بھرے
حالِ سوزِ دل جو عارفؔ سامنے اُس کے کہوں　　رو کے اشکوں سے لگن شمعِ شبستانی بھرے

(۲۲۲)

اٹھا کر رخ سے وہ برقعہ جو گھر سے یک بہ یک نکلے　　خجالت سے نہ پھر خورشیدِ روشن حشر تک نکلے
اگر وہ چھوڑ کر زلفوں کو اپنی دوش تک نکلے　　تو پھر ذمہ ہمارا ہے جو پھندے سے ملک نکلے
سمجھ کر اس کو پھیرا کیجیے آہستہ آہستہ　　سمندِ ناز کی جب تک نہ حضرت کے چمک نکلے
جہاں مدفن ہے تیرے کشتۂ سوزِ تبسم کا　　اگر اس جائے ہم کھوجیں تو لاکھوں من نمک نکلے
کھڑے ہیں لاش پر سارے ہمارے اقربا عارفؔ　　وہ گھر سے اپنے پھر کیوں آج ایسے بے دھڑک نکلے

(۲۲۳)

لب تلک بات تو مطلب کی سدا آتی ہے　　تم سے پر کہہ نہیں سکتا ہوں حیا آتی ہے
مرضِ عشق سناتا ہے ہزاروں طعنے　　جب میرے سامنے پینے کو دوا آتی ہے

ہوگیا بند مگر بابِ اجابت یارب — صبح الٹی جو مرے منہ پہ دعا آتی ہے

کیوں نہ وہ ناک چڑھاویں مرے پاس آنے سے — ہر رگ و پے سے مرے بوئے وفا آتی ہے

دمِ رفتار الجھتے ہیں وہ کیا کیا عارف — شانوں تک جب کہ لہک زلفِ رسا آتی ہے

(۲۲۴)

اس در پہ مجھے یار مچلنے نہیں دیتے — ارمان مرے جی کے نکلنے نہیں دیتے

دم دم میں خبر پہنچے ہے جو آنے کی اپنی — ہے جان لبوں پر وہ نکلنے نہیں دیتے

آشوبِ قیامت سے زبس خوف ہے سب کو — دو چار قدم بھی انھیں چلنے نہیں دیتے

جاتا ہے صفائے رخِ دلدار پہ جب دل — مقدور تک اپنے تو پھسلنے نہیں دیتے (کذا)

عادت میں کرو فرق نہ تم اپنی نگہ سے — کیوں زہر اُسے آج اُگلنے نہیں دیتے

وہ پردہ نشینی کی رعایت ہے تمھاری — ہم بات بھی خلوت سے نکلنے نہیں دیتے

یہ دست بسر رہنے کا عارف وہ محل ہے — اس جا کفِ افسوس بھی ملنے نہیں دیتے

(۲۲۵)

کیجیے اس لائقِ تعذیر کے ٹکڑے ٹکڑے — پر نہ ہوویں کہیں شمشیر کے ٹکڑے ٹکڑے

دم وہ اکھڑا شبِ فرقت میں کہ اب تک اپنے — ہوگئے نالۂ شب گیر کے ٹکڑے ٹکڑے

کھینچتا تھا وہ مگر دل نے نہ چھوڑا ہرگز — آخرِ کار ہوئے تیر کے ٹکڑے ٹکڑے

مجھ کو یہاں تک (بھی) نہیں (خوف) حوادث سے عجب — ہوں اگر شیشۂ تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے

اس غزل کو جو سنے غور سے کوئی عارف — کر کے پھینکے غزلِ میر کے ٹکڑے ٹکڑے

حالِ دل کا مرے وہ لکھنے لگا جب تو ہوئے — خامۂ کاتبِ تقدیر کے ٹکڑے ٹکڑے

(۲۲۶)

یاروں نے کیا کیا اپنے نہ سر بھڑائے — پر ایک کا بھی کہنا خاطر میں ہم نہ لائے

سرسبز ہووے جب وہ مانندِ تخم غافل — ہستی کو اپنی پہلے جو خاک میں ملائے

سروِ چمن کو کیا ہے قامت سے اس کی نسبت — طوبیٰ و سدرہ جس کے کندھے تلک نہ آئے

جور و ستم کی اس کے تدبیر کون سی ہے — بالفرض آہِ دل نے ساتوں فلک جلائے

غزل 223 کے تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں "سب" کے مقام پر "ست" لکھا ہوا ہے۔

تلوار لے کے کیا وہ نکلا ہے گھر سے اپنے — جاتے کہاں ہو عارفؔ تم آج سر اٹھائے

(۲۲۷)

کیا لختِ دل کسو کے اشکوں میں یاد آئے — اُس نے چراغ روشن دریا میں جو بہائے
کچھ بے سبب نہیں ہے یہ لڑکھڑا کے چلنا — جاتے کہاں ہو ہم سے آنکھوں کو تم چرائے
کشتِ امید ہرا خشک اب تلک پڑا ہے — چاروں طرف سے اٹھ کر سو بار ابر آئے
اک ہم ہی خاک وخوں میں لوٹے تیری گلی میں — غیروں نے یوں ہوس سے کیا کیا نہ دل جلائے
ناسورِ دل کو چیرا عارفؔ نے بیٹھے بیٹھے — یہ شخص وہ ہے یارو، روتے کو جو ہنسائے

(۲۲۸)

اتنے بھی اگر آپ میں اخلاق نہ ہوتے — واللہ کہ ہم آپ کے مشتاق نہ ہوتے
یوں چشمِ خلائق سے نہ رہتے جو نہاں ہم — عنقا کی طرح شہرۂ آفاق نہ ہوتے
مجبور ہیں دل سے کہ یہ آزار طلب ہیں — ہم ورنہ کبھی آپ کے مشتاق نہ ہوتے
پہلے ہمیں عاشق تو مقرر کرو اپنا — اس حال میں ہم درخورِ اشفاق نہ ہوتے
معلوم ہے اغیار بد آموز ہوتے ہیں — ہر کام میں عارفؔ وہ کبھو طاق نہ ہوتے

(۲۲۹)

آزمانے کو کوئی خاک مقدر نکلے — خشک دریا سے تعجب ہے کہ گوہر نکلے
نالہ و آہ کی تاثیر کو کیا روتے تھے — چشمِ تر اشک ترے ان سے بھی بدتر نکلے
جو جو صاف اس نے کیا دل کو ہوا کینہ سوا — اور سیقل سے یہ فولاد کے جوہر نکلے
نہ تو روزن کوئی پہلو میں، نہ سینے میں شگاف — دل سے ارمان میرے نکلے تو کیونکر نکلے
اس کے دربان سے بگڑی کہیں شاید عارفؔ — کوچۂ یار سے تم لے کے جو بستر نکلے

(۲۳۰)

یہ مصیبت کہو کب تک کوئی انسان بھرے — ایک دن کا جو ہو بھرنا تو میری جان بھرے
رنج و اندوہ، غمِ ہجر سے آباد ہے دل — گھر میں یہ بیٹھے ہوئے ہیں مرے مہمان بھرے
سرگرانی نہیں بے وجہ یہ اپنی ہم سے — خوب شاید کہیں غیروں نے تیرے کان بھرے
غم گھٹاوے تو بڑھاوے ہمیں شادی کیونکر — کوئی نقصان کرے اور کوئی تاوان بھرے

آرزو ایک بھی عارفؔ نہ برآئی اپنی　　آہ دنیا سے چلے دل میں ہی ارمان بھرے

(۲۳۱)

کچھ کھا کے جو مر جانے کی یہ جی پہ ٹھنی ہے　　ایسی ہی میری جان پہ اب آن بنی ہے

جو درد سے واقف نہیں وہ ہنستا ہے اُس پر　　کیا زخمِ جگر کی یہ عبث خندہ زنی ہے

ہر عضو کے سو ٹکڑے ہوئے ہیں کوئی دیکھے　　غم خوار بہت غم کی وہ اعضا شکنی ہے

بلبل کو رقابت کہیں ہو جائے نہ مجھ سے　　مشہور جہاں میں تری گُل پیرہنی ہے

چُپکا سا اسے تو کہیں مت جانیو عارفؔ　　از روئے تکبر ہے، اگر کم سخنی ہے

(۲۳۲)

یہ اُس کی خبر ہے کہ جو آخر شُدنی ہے　　ہوئی ہے تولد جو گلے میں گُفنی ہے (کذا)

جب آپ کو کہتے ہو تو پتھر کا سمجھ لیں　　پھر کس لیے یہ دعویِ نازک بدنی ہے

حیرت ہے مجھے یہ کہ وہ کیوں تھک نہیں جاتا　　پیماں شِکنی سی کوئی پیماں شِکنی ہے

ہے خاک نکلتی ہے یہ بس سوزِ دروں سے　　کس کام کی ہے پاس جو ہیرے کے کنی ہے

عارفؔ جو کہوں شکر، شکر نکلے زباں سے　　از بسکہ تصور میں وہ شیریں سخنی ہے

آمیز جو ہے تلخیٔ دشنام بھی اُس میں　　اس واسطے ناقص تیری شیریں سخنی ہے

(۲۳۳)

دشمن ہمارے جلنے سے غمناک ہو گئے　　آنکھوں میں ہم سمائے ہیں جب خاک ہو گئے

ہم پر وصالِ یار میں غیرت ہے طعنہ زن　　کیوں زیرِ بارِ منّتِ افلاک ہو گئے

حاصل ہوئی نہ لذّتِ زخمِ خدنگِ یار　　افسوس محوِ حلقۂ فِتراک ہو گئے

گلہائے باغِ خُلد کو آنکھوں میں کیوں رکھوں　　کیا یہ بھی تیرے کوچے کی خاشاک ہو گئے

عارفؔ بجا ہیں چشمِ ملائک میں گر رہیں　　جب خاکِ پائے صاحبِ لولاک ہو گئے

(۲۳۴)

ہم آہ ترے کہنے سے اچھا نہیں کرتے　　لیکن دلِ مضطر کا بھروسہ نہیں کرتے

برعکس ہوا کرتے ہیں سب کام ہمارے　　اس واسطے مرنے کی تمنا نہیں کرتے

وہ شرم ہے ان کو کہ ہے آئینے سے نفرت　　خود دیکھنا اپنا بھی گوارا نہیں کرتے

کاشانۂ ویراں یہ سلامت رہے اپنا　　وحشت میں بھی منہ جانبِ صحرا نہیں کرتے

اس حال میں کچھ نور کی حاجت نہیں عارفؔ — اعضا ہی مرے جب، میرا کہنا نہیں کرتے

(۲۳۵)

(نیاز نامہ) مرا اس کے پاس کیا پہنچے — صبا تو کیا ہے نہ ہرگز جہاں دعا پہنچے
نکل کے جا نہ سکے پھر کہیں قیامت تک — ہمارے گوشۂ زنداں میں گر ہوا پہنچے
ہزاروں بار کہا میں نے باتوں باتوں میں — کبھو نہ پر مرے مطلب کو آشنا پہنچے
بھینچے ہیں دانت وہ بیمار کے ترے کل سے — کہ حلق تک نہیں ممکن ذرا دوا پہنچے
کچھ اس قدر تو نہیں لامکاں عارفؔ — ہزار مرتبہ ہم وہاں پیادہ پا پہنچے

(۲۳۶)

شامت ہے کس کی منہ جو ترے ناصحا چڑھے — جو شخص یوں بلا کی طرح سر پہ آ چڑھے
کیا پائمال برق کو کرنا ہے ان کو آج — توسَن پہ وہ جو دیکھ کے ابرو ہوا چڑھے
پانی جو گھر میں شب مرے رونے سے بھر گیا — لاچار ہو کے بام پہ (سب) یار جا چڑھے
کیا حال ساکنانِ سماوات کا ہو پھر — جس دم تمھاری چرخ پہ تیغِ جفا چڑھے
کیا قدر، منزلت تری دیوانے عشق میں — دفتر میں نام جب کہ نہ عارفؔ ترا چڑھے

(۲۳۷)

کیا گھر سے میرے وہ (مرے) مہمان کو لے گئے — دل سے عبث نکال کے پیکاں کو لے گئے
جل کر لحد میں خاک ہوئے منکر و نکیر — ساتھ اپنے (ہم) جو اِس دلِ سوزاں کو لے گئے
سمجھے مگر وہ گنجِ گوہر، جو نکال کر — نشتر سے میرے دیدۂ گریاں کو لے گئے
گھر کو ہی میرے قیس نے آخر کیا پسند — ہم (اپنے) ساتھ اُسے (جو) بیاباں کو لے گئے
مضمون ان کی چشم کے اس میں جو ہیں رقم — عارفؔ چُرا کے وہ میرے دیواں کو لے گئے

(۲۳۸)

یہ ادائیں مجھ سے رندِ مبتلا کے واسطے! — ان کو رکھیے آپ شیخ و پارسا کے واسطے
ڈر سے ہو جاتا ہے چرخِ پُر جفا کا رنگ سبز — ہاتھ جب اپنے اٹھاتا ہوں دعا کے واسطے
اُس سے بیگانہ ہی رہتے ہم اگر یہ جانتے — اس قدر رسوائیاں ہیں آشنا کے واسطے

غزل 236 کے مقطعے میں ''کرم'' ہے اور (''اشعار'') کی جگہ ''استار'' ہے۔

کام میں میرے بہت عقدے ہیں گردر کارہوں — مجھ سے کچھ لے جایئے زلفِ دوتا کے واسطے
اس لیے خاموش ہوں عارفؔ میں باغِ دہر میں — ہے قفس موجود مرغِ خوش نوا کے واسطے

(۲۳۹)

ہم عبث پھرتے ہیں عالم (میں) وفا کے واسطے — وہ کہیں پیدا نہیں ہے (اب) دوا کے واسطے
صبر کیجیے خواہ وہ بت بوسہ دیوے یا نہیں — اور میں دشمنی کروں دے کر خدا کے واسطے
جس قدر عالم میں ہے میری سیاہ بختی کی دھوم — وہ نہیں شہرت نگاہِ سُرمہ سا کے واسطے
تیری خاکِ راہ کی تاثیر سے واقف نہیں — بوالہوس پھرتے ہیں یوں جو کیمیا کے واسطے
کلبۂ تنگ اب جو میرا ڈھے پڑا اچھا ہوا — شاد ہوں عارفؔ ترستا تھا ہوا کے واسطے

(۲۴۰)

کب لیا ہے میں نے کپڑا پیرہن کے واسطے — بدگماں! رکھا ہے یہ لے کر کفن کے واسطے
دیکھتے ہو صبح اٹھ کر خواب سے روز آئنہ — کس لیے جاتے ہو پھر سیرِ چمن کے واسطے
دے لبِ شیریں کا بوسہ تا یہ ازخود بند ہو — مُہر کیا درکار ہے مرے دہن کے واسطے
وصف کیجیے یار کے شورِ تبسم کا رقم — ہے یہی کافی نمک عارفؔ سخن کے واسطے
دور سے زلفِ پریشاں اپنی دکھلا دو ذرا — حیلہ ہووے کچھ نہ کچھ دیوانہ پن کے واسطے

(۲۴۱)

نے برق سے اندیشہ نہ سیلاب سے ڈر ہے — اپنا کہیں خرمن نہ کوئی رہنے کا گھر ہے
کس بات پہ کس بل پہ یہ بُت ہو گئے مغرور — ہے کون سی خوبی نہ دہن (ہے) نہ کمر ہے
اپنا یہ سرو سینۂ و دامان و گریباں — جو ہے سو تیرے غم میں میرا دست نگر ہے

غزل 239 کے تیسرے شعر میں ''جس کا'' لکھا ہوا ہے۔

غزل 240 صرف چار شعروں پر مشتمل ہے، اس کے ساتھ کوئی مقطع بھی نہیں ہے اور ایسی جدول سازی بھی نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ غزل یہاں ختم ہوگئی ہے۔ دوسری غزل شروع ہو جاتی ہے، جس کے ساتھ ایسا کوئی اشارہ نہیں جو پہلی غزل سے دوسری غزل کو ممیز کر سکے۔

غزل 242 کے مقطعے سے پتا چلتا ہے کہ عارفؔ کا ذہن نعت گوئی پر بھی مائل رہتا تھا مگر ان کے یہاں نعتیہ اشعار خال خال ہی ملتے ہیں۔

ماننِد دِرا کیوں نہ کروں شور شب و روز　جیتا ہوں غمِ ہجر میں لوہے کا جگر ہے
زندوں میں نہ مُردوں میں تجھے رکھتے ہیں عارفؔ　کیا حال ہے تیرا نہ اِدھر ہے نہ اُدھر ہے

(۲۴۲)

تھا کس دن اُس کو شوق بھلا تُرکِ تاز سے　عالم بچے گا کاہے کو اُس حیلہ ساز سے
شاید کہ جانِ سخت میری اب تو نرم ہو　ہوتا ہوں شاد میں عالمِ جاں گداز سے
کانوں میں کس طرح شبِ تارِ فراق کو　لمبی ہو جب کہ یار کی زلفِ دراز سے
محمود کو دکھائیں جو تصویر ہم تری　کچھ ہم کو دشمنی تو نہیں ہے ایاز سے
عارفؔ ہماری خاک اُڑانے سے ہے غرض　تھا کس دن اس کو (ربط) بھلا تُرکِ تاز سے

(۲۴۳)

کی میرے تڑپنے کی نہ تدبیر کسی نے　اس کی نہ دکھائی مجھے تصویر کسی نے
کھانوں سے منوں غم کے بھی سیری نہیں ہوتی　کیا مجھ کو کھلا دی کہیں اکسیر کسی نے
یہ کوہکن و قیس یونہی مرگئے آخر　دیکھی نہ کبھی آہ کی تاثیر کسی نے
شاد اس نگہِ یار کے دھوکے میں ہوا ہوں　مارا ہے میرے سینے میں جب تیر کسی نے
یہ ریختہ وہ ہے کہ کوئی ڈھا نہیں سکتا　عارفؔ کہیں دیکھی ہے یہ تعمیر کسی نے

(۲۴۴)

دیکھیں گے کیا جو کوچۂ جاناں تلک گئے　جب روتے روتے دیدۂ گریاں تلک گئے
پائی نہ وھاں بھی ہم نے تمھارے لبوں کی بات　ہم راہِ خضر چشمۂ حیواں تلک گئے
تم ہو پری جو یہ برے منہ سے نکل گیا　برہم وہ یہ ہوئے کہ سلیماں تلک گئے
سمجھے نہ یہ کہ آپ ہی یوسف ہیں آج کل　ناحق خراب ہونے کو کنعاں تلک گئے
عارفؔ یہ ریختہ بھی نہیں فارسی سے کم　دیوان سیکڑوں مرے ایران تلک گئے

(۲۴۵)

اے خضر تم جو چشمۂ حیواں تلک گئے؟　اُس کے ہی کیوں نہ چاہ زنخداں تلک گئے

غزل 246 کے دوسرے شعر کا پہلے مصرعے میں سہوِ کاتب واضح ہے۔ مخطوطے میں مصرعہ ہے: ''از روئے مصلحت یرقان ہے ہر ایک سے'' مصرع بحر سے خارج ہے۔
غزل 248 کا پہلے مصرعے کی قرأت ممکن نہ ہو سکی۔

وحشت نے پردہ دیدۂ گریاں کا رکھ لیا
وہ موئے سر بڑھے ہیں کہ داماں تلک گئے

عشقِ بتاں میں ذکر ہے کیا تیرا برہمن
ایمان و دیں سے اپنے مسلماں تلک گئے

نشو و نما ہے اب کے وہ فصلِ بہار میں
گل آشیانِ بلبلِ نالاں تلک گئے

پایا نہ کوئی حضرتِ غالبؔ کا ہم زباں
عارفؔ ہم اس تلاش میں ایراں تلک گئے

(۲۴۶)

باز کیوں آتا نہیں اے بے خبر تدبیر سے
کیوں لڑائی کر رہا ہے رات دن تقدیر سے

باوجودِ دشت گردی ہم رہے خلوت نشیں
پاؤں تک باہر نہ رکھا خانۂ زنجیر سے

بس کہ خوگر ہم خموشی کے تمھاری ہو گئے
رات دن کرتے ہیں باتیں آپ کی تصویر سے

حالِ بد سُن کر ہمارا سب کو عبرت ہو گئی
تھا رقابت کا خطر جاتا رہا تشہیر سے

بعدِ مُردن بھی نہ عارفؔ جائے گا آنکھوں سے نور
ہیں یہ روشن خاکِ راہِ حضرتِ شبیر سے

(۲۴۷)

سنو اِس کان یا اُس کان کو سونے کا بالا ہے
کسی کی پر غلامی کا یہ تم نے حلقہ ڈالا ہے

شکایت آج جو کرتے ہیں ہردم دردِ ساعد کی
کہیں شاید کہ گوئے گل کو ہاتھوں میں اچھالا ہے

یہ صورت لیلیٰ و شیریں و سلمیٰ نے کہاں پائی
حسیں تھے یہ بھی سب لیکن ترا عالم نرالا ہے

ہمارے گریہ نے کھویا وصالِ یار سے ہم کو
کیا ہے وعدہ آنے کا مگر رستے میں نالا ہے

نگاہِ یار کیا شے ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا
جگر کے پار ہوتی ہے نہ برچھی ہے نہ بھالا ہے

جوابِ صاف دیجے، ترش روئی سے ہے کیا حاصل
کھٹائی میں مجھے کس واسطے یہ تم نے ڈالا ہے

زبس بہتے ہیں کر (بھی) (اشعار) میرے آجکل عارفؔ
غزل خوانی (سے) عاری ہوں زباں پر میری چھالا ہے

(۲۴۸)

ہرزہ گردی سے دلا خانہ نشیں کیوں نہ ہوئے
آدمی ہونے سے ہم کاش نگیں کیوں نہ ہوئے

اس قدر رنج جو ہے آپ کو مرنے کا مرے
تم میرے پاس دمِ بازپسیں کیوں نہ ہوئے

تھا جو مسجودِ بتاں آپ کو ہونا منظور
رونق افزائے صنم خانۂ چیں کیوں نہ ہوئے

اے ملائک نہ کرو ذکرِ خطائے آدم
تم ہی اس گنجِ امانت کے امیں کیوں نہ ہوئے

ہم سے دیکھا نہیں جاتا یہ ترا حالِ زبوں
عارفؔ اس وقت میں ہم اور کہیں کیوں نہ ہوئے

(۲۴۹)

ہمارا شعر اک لکھا جہاں ہے — وہ اقلیم سخن کا ارمغاں ہے
چڑھا آہوں کا وہ میری دھواں ہے — کہ سب کہتے ہیں دسواں آسماں ہے
جگر خوں کن جو کچھ یہ داستاں ہے — ہمارے حال کا شاید بیاں ہے
ہمارا جس شجر پر آشیاں ہے — چمن اس کا فضائے لامکاں ہے
سند ہے جو کہ ہم کہہ دیویں عارف — زبانِ ریختہ اپنی زباں ہے
صفائے دل کی ہے یہ اپنے خوبی — نظر آتا جو، ہر رازِ نہاں ہے

(۲۵۰)

ہوئے پر خاک، یہ قصہ کہاں ہے — یہیں تک یہ فلاں ابنِ فلاں ہے
رخِ رنگیں ترا وہ گلستاں ہے — کہ جس کا، آپ خالق، باغباں ہے
وہ عالم کا ہمارے آسماں ہے — زمیں (جس کی) فضائے لامکاں ہے
بھلا ہم بھی (تو) دیکھیں وہ کہاں ہے — کمر باندھو جو قصدِ امتحاں ہے
زبس مضمون ہیں فرقت کے عارف — جدا سب سے مرا طرزِ بیاں ہے
لگے گی آنکھ کیونکر آج ان کی — میرا غم خوار ہی جو قصہ خواں ہے

(۲۵۱)

(۲۵۲)

آثار دیکھ کر میری چشمِ پُرآب کے — یہ قاعدے بنائے ہیں سب فنِّ باب کے
کچھ تم کو دیکھتے ہی یکایک سنبھل گیا — شاہد ہیں لوگ سب مرے حالِ خراب کے
جو آج کل ہے عاشقی و دلبری کی طرز — پھرتے ہیں ایسے عاشق و معشوق داب کے
اللہ رے زور شعلۂ جوالہ بن گیا — چکر بلا ہیں گردشِ جامِ شراب کے
عارف بجا ہے مدح کریں اپنی جس قدر — ہیں مدح خواں جنابِ رسالت مآب کے

غزل 252 کے پہلے شعر میں تلمیح کی وجہ واضح نہیں ہے۔ زلیخا کسی کارواں کی منتظر نہ تھی۔

(۲۵۳)

کون سا بزم میں ہے آپ کا نقصاں مجھ سے
کون سی بات کیا کرتے ہو پنہاں مجھ سے

دل کو لیتا ہے تو حاضر ہے یونہی لے جاؤ
ہیچ کرتے ہیں عبث کا کل پیماں مجھ سے

لذتِ درد سے بیچارہ نہیں ہے واقف
لے گیا چھین کے غم خوار نمکداں مجھ سے

موت کو لکھتے ہیں قانونِ محبت میں شفاء
درد کا آئے پوچھے کوئی درماں مجھ سے

بُت کہیں یہ سرِ شوریدہ دیا ہے عارفؔ!
پہلے جب چھین لیا چرخ نے ساماں مجھ سے

(۲۵۴)

کاوشیں کرنے لگا یار کا درماں مجھ سے
کل چھٹا آج چھٹا کوچۂ جاناں مجھ سے

خالقِ ہر دو جہاں عرش کو کر اور بلند
اب تو رُکتے نہیں یہ دیدۂ گریاں مجھ سے

کھا چکا عہدِ وفا پر رخِ روشن کی قسم
پھر یہ اٹھواتے ہو تم کس لیے قرآں مجھ سے

ہجر میں سینے سے ہاتھوں کو فراغت ہی کہاں
ہو سکے خاک بھلا چاکِ گریباں مجھ سے

مجھ کو حیرت ہے کہ مذہب ہے میرا کیا عارفؔ
خوش ہیں کافر ہی نہ راضی ہیں مسلماں مجھ سے

(۲۵۵)

مجنوں کو لوگ کہتے ہیں صحرا نورد ہے
اک وہ تو کیا کہ خضر میرے آگے گرد ہے

یرقان کہے ہر ایک سے، از روئے مصلحت
ہم دم اگرچہ غم سے میرا رنگ زرد ہے

کیا کیا نہ رشک سے مجھے آتے ہیں پیچ و تاب
مرتی تمہارے ہاتھ سے جب میری نرد ہے

لادے وے ایک دشنا جو اس اضطراب میں
کہنے کو یار ہیں یہ، برا کس کو درد ہے

عارفؔ ہمارے گھر سے تو گزرا ہی نہیں کبھو
مجنوں کو لوگ کہتے ہیں صحرا نورد ہے

(۲۵۶)

ہم کو وہ پاس آنے کے ....
اندیشہ پھر ہے کاہے کا جب آزما چکے

سو کوس بھاگتے ہیں اندھیرے کو دیکھ کر
جن کا یہ حال ہو وہ میرے گھر میں آ چکے

منظور گر یہی ہے تو خنجر نکالیے
در سے تمہارے سر کو ہم اپنے اٹھا چکے

جب سے ہمارے لب پہ یہ بت خانہ تک آ پڑا
یہ نالہائے صبح فلک کو جلا چکے

عارف بس اب تو پانی ہی پانی ہے ڈوبیے
ہم خاک راہِ عشق میں تھوڑی اُڑا چکے

(۲۵۷)

اس زمانے سے اماں حیران کیونکر مانگتے
کون ہے بابرکت ایسا جن سے چادر مانگتے

دردمندوں کا دعا میں ہے سدا معمول یہ
خار اول مانگتے اور بعد بستر مانگتے

تم کو ہم دیویں نہیں، یہ عقل میں آتا نہیں
جان جو اب مانگتے ہو کچھ سمجھ کر مانگتے

خار پا کو خار سے ہی اب نکالا چاہیے
کس سے اب اُس وادیِ غربت میں نشتر مانگتے

نذر عارفؔ آپ کی کرتا ہے صبر و جان و دل
لیکن ایماں، سو کہاں اک یہ سمجھ کر مانگتے

(۲۵۸)

جو گھر میں میرے آنا ہو تو وعدہ مہرباں کیجیے
گھُلا جاتا ہے دم چُپ سے نہیں کیجیے کہ ہاں کیجیے

نہیں کھلتا ہے سامع پر میری تقریر درہم سے
نہاں اُس حال میں بھی ہے جو رازِ نہاں کیجیے

سوا اُس کے نہیں تقریب اس کے پاؤں پڑنے کی
کہ سب میں آپ کو مشہور پہلے ناتواں کیجیے

تقاضا احتیاطِ عشق کا یہ ہے جو سچ پوچھو
کہ دل کو بھی کبھو اپنے نہ اپنا رازداں کیجیے

جو دن مرمر کے کرتا ہوں تو شب مرمر کے ہوتی ہے
غمِ فرقت میں جیتا ہوں نہ یہ ہرگز گماں کیجیے

خدا نے گر دیے ہوں کان تو سنیے یہ اک مطلع
مگر مشکل ہے گر اس پر عمل اے مہرباں کیجیے

نہ چشمِ سلطنت رکھیے نہ امیدِ جناں کیجیے
یہی بہتر ہے سب باتوں سے ترکِ دو جہاں کیجیے

(۲۵۹)

اگر جویائے یوسف ہیں تو جاویں شہرِ کنعاں کو
زلیخا کی طرح کیوں انتظارِ کارواں کیجیے

خجالت گر رقیبوں کی گوارا دل نہ کرتا تھا
کہا تھا آپ سے کس نے کہ میرا امتحاں کیجیے

فقط الزام دینے کو وہ آئے اپنی خاک پر میری
کہاں سے لائیے جان ان کی کیا خاطر نشاں کیجیے

چھپاؤ منہ نہ تم ہم سے کہ سب ہوتے ہیں چشمک زن
نہ ناحق آپ کو دانستہ رسوائے جہاں کیجیے

ہمیں تو آہ بھی کرنی ہے مشکل ان دنوں عارفؔ
جگر کے ٹکڑے ہوتے ہیں اگر شور و فغاں کیجیے

(۲۶۰)

فرقت میں زندہ دیکھ کے وہ مہ جبیں مجھے
از روئے طنز کرنے لگا آفریں مجھے

خو، ہوگئی ہے اب انھیں نیچی نگاہ کی
جیتا ہی داب دو، کوئی زیرِ زمیں مجھے

مخطوطے میں غزل 257 کے تیسرے شعر میں "اے فلک تو" ہے۔ آہنگ کے اعتبار سے قرأت درست کردی گئی ہے۔ مقطعے میں دوسرا مصرعہ ہے "یہاں چلے آتے ہیں جب تک دل نہ لہرائے ہے"۔

تھا مارنا انھیں مجھے فرطِ نشاط سے — ورنہ بٹھاتے کس لیے اپنے قریں مجھے
شب آئے وہ یہ مجھ کو رہا خواب کا خیال — وعدہ یہ تھا جو ان کے نہ عارفؔ یقیں مجھے
یوسف کی طرح مجھ کو بھی کرتا کوئی غلام — خالق کا شکر ہے نہ بنایا حسیں مجھے

(۲۶۱)

نوش و نیشِ شادی و غم سے جہاں معمور ہے — عالمِ امکاں سراسر خانۂ زنبور ہے
زخمِ شمشیرِ نگاہ محسوس ہوتا ہے کسے — چارہ گر بے کار (ترا) مرہم کافور ہے
کُلبۂ تاریک سے بھاگے ہے اس کے در کی موت — اس سبب سے اب تلک جیتا تیرا رنجور ہے
نام مشتِ گِل کے ہم نے آ کے یاں کیا کیا سنے — کوئی اسکندر کوئی دارا کوئی فغفور ہے
جب سے پیشانی پہ قشقہ کھینچ کر بیٹھے ہیں آپ — آپ کے چہرے پہ عارفؔ کیا برستا نور ہے

(۲۶۲)

شغل اُس کو اور کیا ہے جو ترا مہجور ہے — اشتیاقِ موت ہے یا انتظارِ گور ہے
جان یاں آتی تو ہے لیکن ٹھکانہ دیکھ لے — رات دن میرے لبوں پہ نالۂ پُرشور ہے
ناتواں ہو کر ہوئے ہیں کس قدر نازک دماغ — ہم کو آوازِ مگس گویا صدائے صور ہے
تو نے کی ذرہ نوازی آ کے یاں خورشید رو — صدقے اس دن کے سلیماں، مہمانِ مُور ہے
گرمیِ رفتارِ ساقی جو دل پر جز گئی — ایلوے میں دل کے عارفؔ لذتِ انگور ہے

(۲۶۳)

ناخنِ فولاد سے گھڑیوں کھجاتے ہیں اُسے — اتفاقاً گر کبھو زخمِ جگر کھجلائے ہے
یار مجھ بے خانماں کی لاش پر روتے ہیں کیوں — خانۂ اصلی کو جاتا ہوں خوشی کی جائے ہے
بوجھ سے سجدوں کے ہل سکتا نہیں زنہار سر — شوق دیکھوں کس طرح در تک تیرے پہنچائے ہے
جو نہ دیوے بات کا موسیٰ کی بھی ہرگز جواب — وہ بُتِ مغرور کب صورت ہمیں دکھلائے ہے
کھنچے گا دل میں عارفؔ عالمِ بالا کی سیر — اب تو کچھ اس خاکداں میں دل بہت گھبرائے ہے

(۲۶۴)

کیا خوشی ہوتی ہے جس دم گھر مرے وہ آئے ہے — بڑھتے بڑھتے آسماں سے سر مرا لگ جائے ہے

غزل 260 کے مقطعے کے دوسرے مصرعے میں ''خس'' سے پہلے ''بی'' (بے) لکھا ہے۔

چارہ گر لے لے کے مرہم کس لیے تو آئے ہے — جب تلک بھرتے ہیں اس میں زخم دل بھر جائے ہے

ایک دو نالوں ہی میں تو اے فلک گھبرا گیا — اس کے دل کو دیکھ جو رہتا میرے ہمسائے ہے

ایک دھما دھم کی صدا آتی ہے کانوں میں بڑی — آج پھر دیوانہ تیرا سر کہیں ٹکرائے ہے

اے خضر، میخانے میں عارف کا کب تک انتظار — یہاں چلے آتے ہیں جب دل ان کا ٹک لہرائے ہے

(۲۶۵)

لے کر دیارِ عشق سے ہم داغِ غم چلے — یہ شہر وہ نہیں ہے کہ جس جا دِرم چلے

ہوتے ہیں خشک گرمیٔ رفتار سے کنویں — تپنے لگے زمین جو وہ دو دو قدم چلے

نکتہ کی بھی ہجوم مطالب سے جا نہیں — لکھتا ہوں نامہ اس کو یہ کیونکر قلم چلے

صورت کو آدمی کی ہم اس میں ترس گئے — کعبہ سے اٹھ کے جانبِ بیت الصنم چلے

عارف خدا نخواستہ باشد کہ وہ صنم — کیا قہر ہووے جو کبھو سوئے حرم چلے

(۲۶۶)

خیر ملنے کی قسم آپ تو ہیں کھائے ہوئے — دل کو مقدور تلک ہم بھی ہیں ٹھیرائے ہوئے

کِھل گئی ہے کہیں شاید میرے دشمن کی زباں — ہوگئے دن جو بہت تار سے لڑوائے ہوئے

اپنے نزدیک ہے پستی و بلندی یکساں — رخشِ ہمت کو چلے جاتے ہیں ٹھکرائے ہوئے

پاؤں ٹیکا نہیں جاتا ہے زمیں پر اب تو — بسکہ ایک عرصہ ہوا خار نکلوائے ہوئے

آج کیا تیغ بکف اس کو سنا ہے عارف — آپ اس وقت جو یوں جاتے ہیں گھبرائے ہوئے

(۲۶۷)

اس عمر میں کسی کو کب فکرِ پیش و پس ہے — کرتے ہیں شادخواری ہمسائے میں عسس ہے

ہو، کیا ابھی موثر زہر نگہ کی تلخی — نامِ خدا ابھی تو میٹھا انھیں برس ہے

گو اب تلک نہیں ہیں صید افگنی کے قابل — پر کھیلتے ہیں جس سے یا دام یا قفس ہے

گھنگھرو پہن کے پھرنا ان کا وہ ہے قیامت — سُن کر کہے برہمن یہ نالۂ جرس ہے

سونپا یہ کام ہم نے آنکھوں کو اپنی جب سے — کوچے میں اُس کے عارف نے خار ہے نہ خس ہے

(۲۶۸)

شوخ ہے چشم تری ابروئے خمدار تلے — یہ وہ آہو ہے کہ ڈرتا نہیں تلوار تلے

جلوہ فرما تو لبِ بام ہے وہ زہرہ جبیں — اور لٹکے ہے پڑی کاکلِ خمدار تلے

بدشگونی وہ سمجھ کر نہ اٹھاویں ہم کو   اس لیے روئے نہ ان کی کبھی دیوار تلے
ہم نے ہر زخم پہ ہرچند اٹھائی لذت   پر کبھی سر نہ ہلایا تری تلوار تلے
عارفِ سوختہ جان کی تو نہیں ہم کو خبر   خاک کا ڈھیر ہے پر اک تری دیوار تلے

(۲۶۹)

کیوں لیے پھرتے ہو تم تیر و کمان میرے لیے   ہے نگاہِ چشم فتّاں ہی سِناں میرے لیے
آپ کیوں بدنام ہوں (اے) مہرباں میرے لیے   کم ہے کیا جور و ستم کو آسماں میرے لیے
مر کے تم پر ہو گیا ہوں بس کہ میں ہر دلعزیز   اس لیے روتے ہیں سب خورد و کلاں میرے لیے
اور بھی جیتا اگر تو قصے ہو جاتے بہت   کرتے ہیں افسوس سارے قصہ خواں میرے لیے
کون کہہ سکتا ہے یاں میرے برابر ریختہ   شک نہیں عارف کہ ہے بس یہ زباں میرے لیے

(۲۷۰)

ترے غم میں اگر طوفاں اٹھائے اپنی آنکھوں سے   تو رو کر گنبدِ گردوں گراتے اپنی آنکھوں سے
درِ جاناں کا کیا بہتر ہے سنگِ اسودا اے زاہد   کہ ہم بھی چوم کر اُس کو لگاتے اپنی آنکھوں سے
غمِ فرقت میں رونے کی کسے فرصت ہے اب ورنہ   ہم اپنی آتشِ دل کو بجھاتے اپنی آنکھوں سے
خیال چشم مستِ یار میں رونا اگر آتا   شرابِ ناب کی نہریں بہاتے اپنی آنکھوں سے
سمجھ کر دیکھتے عالم میں گر ہر ایک کو عارف   تو ہم اس طرح کا دھوکا نہ کھاتے اپنی آنکھوں سے

(۲۷۱)

تم لقب اپنا نہ دو اے یوسف ثانی مجھے   قید کر کر مت کہو ہر بار زندانی مجھے
جب کوئی کہتا ہے رضواں دیکھنے لگتا ہوں میں   تو نے اپنے در کی دی ہے جب سے دربانی مجھے
سجدے چھپ چھپ کے کیے راتوں کو کوئے یار میں   پر نکلوا کر رہے گا داغ پیشانی مجھے
تشنہ کام اُس وادیِ پُر خوں میں ہوں اے خضر (میں)   آب ہو زہرہ نہ جب تک، کب ملے پانی مجھے
سامنے تیرے کروں کیا (اب میں) عارف کا بیاں   ہم نشیں آتی نہیں ہے مرثیہ خوانی مجھے

(۲۷۲)

کچھ غم نہیں جو عشق نے رسوا کیا مجھے   عاشق تو تیرا کہتی ہے خلقِ خدا مجھے!
جب مر گیا تو دردِ محبت کھُلا مجھے   آتا نہ اعتبار جو ہوتی شفا مجھے

بے ہوش گر کہ شور و فغاں کچھ نہ ہو سکے — پردہ اٹھا کے تو رخِ روشن دکھا مجھے
ہے مجھ کو بارِ منت و احساں کا کب دماغ — بارِ گراں ہے سایۂ سالِ ہُما مجھے
عارف کبھو میں نام بھی لیتا نہ عشق کا — معلوم اس کی ہوتی جو نہ انتہا مجھے

(۲۷۳)

دل صنوبر کو دیا حق نے ثمر کے بدلے — کیا بلا آہِ سحر تجھ کو اثر کے بدلے
لاغری سے ہوئے ہم خانہ نشیں وحشت میں — روزنِ مور ملا دشت میں گھر کے بدلے
کچھ شبِ وصل میں بھی چین نہ پایا ہم نے — رات بولے ہے پری مرغِ سحر کے بدلے
سامنے یار ہے پر ضعف میں دیکھوں کیونکر — واں تلک میں کسے پہنچاؤں نظر کے بدلے
نہ رہی طاقتِ گفتار بھی ہم میں عارف — چرخ لیتا ہے یہ اب آہِ سحر کے بدلے

(۲۷۴)

دمِ عیسیٰ ہے ترے لب میں سخن کے بدلے — حق نے یہ بات عطا کی ہے دہن کے بدلے
شرم کیجیے پہ نگہِ لطف کی رکھیے ہم پر — آنکھ کیوں ہم سے چراتے ہو بدن کے بدلے
دل میں ہر ایک کے میرا گھر ہے غریبی کے سبب — مُلکِ دل مجھ کو ملا ترکِ وطن کے بدلے
لاغری سے یہ ہوا حال ہمارا کہ عیاں — ہے جبیں پر خطِ تقدیر، شکن کے بدلے
ریختہ کیونکہ نہ ہو جائے ہُما پھر عارف — ہم نے سب قاعدے اس طرزِ کہن کے بدلے

(۲۷۵)

اشکِ مژگاں پہ میرے دیدۂ تر بھاری ہے — ہے جو پتلا یہ شجر اس پہ ثمر بھاری ہے
بے قراری میں نہیں چین کسی وجہ مجھے — دل جو کچھ رونے سے ہلکا ہے تو سر بھاری ہے
گوشِ نازک جو تیرا سرخ ہی رہتا ہے — ہاں نزاکت کے سبب اس کو گوہر بھاری ہے
میرے ہمسایہ میں آ کر جو لیا گھر اس نے — غیر کہتا ہے کہ سنتے ہیں یہ گھر بھاری ہے
ہے کدھر قاتلِ بے باک کا کوچہ عارف — ایک مدت سے (مرے) دوش پہ سر بھاری ہے

(۲۷۶)

بے کار مر کے بھی تو ہم نہ خستہ تن ہوئے — قربان تیرے اے بتِ ناوک فگن ہوئے
عاشق تو فکرِ زر سے چھٹے یہ بھی شکر ہے — معشوق بارے آپ ہی خود سیم تن ہوئے

برسوں ہوئے کہ آپ میں آتے نہیں ہیں ہم
بیٹھے ہیں اپنے گھر میں غریب الوطن ہوئے
پروانہ تو جلا ہے ولے اہلِ انجمن
اشکوں سے شمع کے بھی لبالب لگن ہوئے
عارفؔ نہ پوچھ حال ہمارا تو عشق میں
رسوا ہوئے خراب ہوئے بے وطن ہوئے

(۲۷۷)

شاد کیا پھرتے ہیں ہم گنبدِ مینا کے تلے
ایک دن جائیں گے اِس خطۂ غبرا کے تلے
چرخ ہفتم سے تو شب نالۂ دل گذرا تھا
رہ گیا سوچ کے کچھ عرشِ معلّٰی کے تلے
بستیٔ عشق وہ ہے دھوپ میں جلنا دائم
رکھ نہ لینا کچھ اگر اپنی کفِ پا کے تلے
یاد آیا جو کسی کا قدِ بالا ہم کو
روئے منہ ڈھانپ کے ہم سایۂ طوبیٰ کے تلے
بدگمانی مجھے جتنی ہو بجا ہے عارفؔ
چڑھ گئے بام پہ وہ شب مجھے بٹھلا کے تلے

(۲۷۸)

میرے دل کو بٹھا دیا کس نے
آ کے کعبے کو ڈھا دیا کس نے
پوچھو اپنے ہی غمزہ سے کہ مجھے
خاک میں ہی ملا دیا کس نے
کیا تماشا ہے پوچھتے ہیں وہی
تیرے گھر کو لٹا دیا کس نے
شبِ فرقت میں کیا نہ ہم کھاتے
ہم کو پر زہر لا دیا کس نے
وہ جلا دیتے ہیں جو خط میرا
اُن کو عارفؔ پڑھا دیا کس نے

(۲۷۹)

پیچ میں ہم نہیں اُس زلف کے آنے والے
اور ہوتے ہیں عبث دل کو پھنسانے والے
دل میں کس روز جگہ آپ نے دی ہے مجھ کو
آپ ہیں کون مجھے دل سے گرانے والے
نالہائے شرر افشا کا بُرا ہو یارب
اور نکلے یہ مرے گھر کے جلانے والے
شوقِ دیدار میں عشاق جو مرتے ہیں مریں
وہ تو ہرگز بھی نہیں پردہ اٹھانے والے
تو پڑھے شعر اگر سب سے ہے بہتر عارفؔ
یہ طبیعت تو نہیں سر کو ہلانے والے

(۲۸۰)

لاؤں زباں پہ مطلبِ دل کیا مجال ہے
میں کیا کہوں فقیر کی صورت سوال ہے
اب غم میں سر کو پیٹ کے کس کس کو نوچیے
ہر موئے سر میرا میرے سر پر وبال ہے

اس پر تمام تخت نشینوں کو رشک ہے
جو شخص رہگذر میں ترے پائمال ہے
شاکی ہیں میرے دیدۂ (تر) سے اُدھر کے لوگ
تھوڑا سا بھی زمین کا جس سمت ڈھال ہے
عارف خدا کے واسطے کسبِ ہنر نہ کر
ہے آج کل خراب جو اہلِ کمال ہے

(۲۸۱)

جا کبھو تو بھی بازار کو ہولے ہولے
لوٹ ہر اک خریدار کو ہولے ہولے
زیرِ سُم طالبِ دیدار نہ پس جائیں کہیں
ایک ذرا ہانکیے رہوار کو ہولے ہولے
ناتوانی سے نہیں پہلے سے سر میں طاقت
ڈھاہی دیں گے تری دیوار کو ہولے ہولے
آ کے کوچہ میں ترے رہ گئے اس کے پیچھے
لائے یاں تک تیرے بیمار کو ہولے ہولے
پاس اغیار کا اتنا تو انھیں ہے عارف
پڑھتے ہیں وہ میرے اشعار کو ہولے ہولے

(۲۸۲)

یہ دل خوش، زہر گر ہووے تو ہووے
ہمیں کیا گر شکر ہووے تو ہووے
مزے میں آج صہبا کے برابر
میرا خونِ جگر ہووے تو ہووے
شبِ فرقت میں منہ فق ہوگیا ہے
یہی اس کی سحر ہووے تو ہووے
اٹھاوے جو تمھارے اس ستم کو
وہ میرا ہی جگر ہووے تو ہووے
لبوں پر آہ کیا ڈھونڈے ہے ہمدم
کہیں وہ اشک پر ہووے تو ہووے
دلِ جاناں میں عارف تیرا (گھر کیا)
کہ پیراہنِ شرر ہووے تو ہووے

(۲۸۳)

کب گھر کو کیا اپنے بیاباں کسی نے
دیکھا ہے مرا خانۂ ویران کسی نے
کیا قبضہ کیا غم نے مرے خانۂ دل میں
یارو یہ سنا ہے کہیں مہمان کسی نے
وہ آ کے مرے خانۂ ویران کو دیکھیں
گھر ہوتے جو دیکھا نہ ہو میدان کسی نے
کیا کیا غمِ الفت میں مری ہوگئی حالت
دیکھا ہی نہیں اُن کے اک آن کسی نے

غزل 280: سیدھی سادی مگر تکرار سے آنے والی ردیف اچھی ہے۔ شعر بہرحال عارف ہی کے رنگ کے ہیں۔ مقطعے میں عارف کا لفظ دو جگہ آگیا ہے۔ پہلے عارف کا لفظ باقی رہ گیا اور دوسرا جو مخطوطے میں کچھ مٹا ہوا ہے۔ قیاسی تصحیح کے طور پر راقمہ نے اپنی طرف سے ایک لفظ بڑھایا۔

عارفؔ کبھی مسجد میں ہے، بت خانہ میں گاہے ایسوں کو بھی سمجھا ہے مسلمان کسی نے

(۲۸۴)

جینا مفارقت میں خلافِ قیاس ہے سچ ہے مگر مجھے ترے ملنے کی آس ہے
اک زہر کے سوا مرضِ عشق میں طبیب وہ کون سی دوا ہے کہ عاشق کو راس ہے
ہوتا چلا ہے کیا میرے نالے میں کچھ اثر کچھ رات سے جوان کی طبیعت اداس ہے
کیا روزِ حشر کی بتِ پیماں شکن خوشی ایفائے وعدہ کی مجھے کب اس سے آس ہے
عارفؔ کرے نہ زلزلہ روزِ حشر سے یہ ریختہ کا قصر وہ محکم اساس ہے

~~~~~
~~~~~

دیوانِ دوم

غزلیات

ردیف (الف)

(۱)

تجھ کو ہی دیں گے دل جو یہ اب کے سنبھل گیا
تیرا ہی دم بھریں گے جو دم بھی نکل گیا

ہر آبلے کو شیشۂ مے کیوں نہ چاہیے
دل سوزِ عشقِ ساقیِ گل رو سے جل گیا

ہاں منقطع ہو سلسلۂ زلفِ مہوشان
گر عاشقوں کے سر سے جنوں ہی نکل گیا

داغِ جگر سے صورتِ قفس فراق میں
اک آہ دل سے کھینچ کے میں آپ ہی جل گیا

عارف کیا ہے کچھ تو اثر آہِ دل نے واں
اغیار آج دیکھ کے مجھ کو جو ٹل گیا

(۲)

غم میں بن کے سودائی دل ہے شادماں اپنا
ہے، عیاں ہوئے پر بھی، رازِ دل نہاں اپنا

دیکھتے ہی خط تیرا ہم خوشی سے مرجاتے
یوں کہو کہ واقع میں تھا وہ حرزِ جاں اپنا

زلف و دل کے جھگڑے میں ہم کو بولنا کیا تھا
بہکے ہیں قدم رکھ کر ہم بھی درمیاں اپنا

ہم سے تشنہ لب جا کر کیا کریں سمندر پر
چشم تر کے جب ہوتے خشک ہے دہاں اپنا

سب کسی کے ہوتے ہیں تو عبث نہ کھو عارف
جان رائیگاں اپنی مال رائیگاں اپنا

(۳)

کیوں آئینے میں دیکھا تو نے جمال اپنا
دیکھا تو خیر دیکھا پر دل سنبھال اپنا

اُس کا ہو جب تصور کب ہو خیال اپنا
کیسی مصیبت اپنی کیسا خیال اپنا

اس غزل (۳) میں چار مطلع آئے ہیں، ان چاروں مطلعوں کو نقل کر دیا گیا تا کہ غزل نگاری میں ایک سے زیادہ مطلعے پیش کرنے کی شاعرانہ کوشش کے معنی سمجھ میں آجائیں۔

کھویا غمِ رفاقت دیکھو کمال اپنا　　بہکا دیا ہے سب کو دکھلا کے حال اپنا
بن دیکھے تیری صورت جینا وبال اپنا　　بن آئے تیرے ظالم مرنا محال اپنا
خرمن تو دیکھ لیتے بجلی بلا سے گرتی　　ہونا تھا کھیت عارفؔ یوں پائمال اپنا

(۴)

مضطر ہوئے تو حالِ دل ان کو سنا دیا　　اب وہ کہا کریں کہ ہنسی میں اڑا دیا
ہرگز نہ مجھ کو قند و شکر نے مزا دیا　　تھوڑا سا زہر اس میں نہ جب تک ملا دیا
اپنا میرا معاملہ سب کو جتا دیا　　مجھ کو اٹھا کے بزم سے پردہ اٹھا دیا
ہلکا ہوا تھا تیری نزاکت کو دیکھ کر　　تو نے سمجھ کے کیا مجھے دل سے گرا دیا
روتا ہے اپنے حال پہ اوروں کی شکل دیکھ　　عارفؔ بڑوں بڑوں کو انھوں نے ہٹا دیا

(۵)

یہ تو معلوم ہے ممکن نہیں احساں کرنا　　کب تلک، لیک، ستم گردشِ دوراں کرنا
بارِ عالم سے ہو باہر، جو ڈبوتے ہو جہاں　　کہیں ایسا نہ غضب دیدۂ گریاں کرنا
کیوں نہ عزت سے مروں میں کہ تجھے پردہ نشیں　　عالمِ الغیب سے ممکن نہیں پنہاں کرنا
میری بالیں پہ دمِ نزع نہ آؤ صاحب　　فائدہ کیا ملک الموت کو حیراں کرنا
پہنچے گر عرشِ معلیٰ پہ تو پھر کیا عارفؔ　　طے ابھی اس سے سوا اور بھی میداں کرنا

(۶)

ہے، خمِ ابرو، بتِ رنگیں ادا میں، بل پڑا　　ہوگئے مبہوت تیغِ بے بہا میں بل پڑا
پیچ و تابِ دل کا مرے ہے یہ ایک ادنیٰ اثر　　اک ذرا دل کو ہوا دی تو ہوا میں بل پڑا
پیچ ہر قسمت کے مری یار نے جو کی نظر　　خود بہ خود تارِ نگاہِ فتنہ زا میں بل پڑا
میں نے کیوں ڈالا گلے میں اسکے شب پھولوں کا ہار　　جل اٹھا موئے میانِ دل ربا میں، بل پڑا
مت کہو وہ بات عارفؔ جو گراں خاطر بنو　　کیا مزا ہے گر جبینِ آشنا میں بل پڑا

(۷)

زاہد تجھے گر مرتبہ حاصل ہے فنا کا　　حیران ہوں، پھر کس لیے طالب ہے خدا کا

اس غزل (۴) میں بھی تین مطلعے آئے ہیں، جن کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ غزل کافی طویل الذیل ہے اور اس میں تین مطلعوں کے علاوہ مقطع کو شامل کرتے ہوئے ستائیس شعر ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ عارف اپنے زمانے کے استادانہ رویے کے پابند بھی ہیں اور طویل طویل غزلوں سے ان کو دلچسپی بھی ہے۔

جو ہو بنی آدم اسے کیا عیب خطا کا
قرآن میں جب ذکر ہو واعظ "بہ قضا" کا
ہوں راہ روِ "مسلکِ تجرید" جہاں میں
کب ساتھ گوارا ہو مجھے راہ نما کا
ہر چند وہ نازک ہیں پر ایک جھٹکے میں توڑیں
رشتوں سے بھی باندھا ہو جو پیمان وفا کا
عارفؔ ابھی صفحے پہ قلم سجدہ فشاں کا
گر قافیہ تحریر کروں شیرِ خدا کا

(۸)

بیمار پہ کیا پڑے اثر آب و ہوا کا
مشکل کہیں آسان ہو (ہے) وقت دعا کا
ہر حال میں کیونکر نہ کروں شکر خدا کا
پڑھتا ہوں سبق نسخۂ تسلیم و رضا کا
حق پر ہے نظر پہلے یہ عالم ہے صفا کا (کذا)
ہاتھوں پہ ترے رنگ بڑھا کیونکہ حنا کا
وہ ضد سے میری خون کرے پیکِ صبا کا
کٹتا نہیں تلوار سے پر جسم ہوا کا
کیا پوچھتے ہو وصف میرے عُقدہ کشا کا
وہ ہاتھ خدا کا ہے وہ ہم نام خدا کا
معلوم کسے ہے مرضِ عشق کی تاثیر
گل جائے زباں میری جو لوں نام دوا کا
سجدوں کو جو یوں سب کے روا رکھے ہے عارفؔ
ہے سر کو میرے ذوق درِ آلِ عبا کا

(۹)

دن بہ دن حال ہوا کس کا بہتر اپنا سا
کوئی عالم میں نہیں اہلِ ہنر اپنا سا
کہوں کس طرح کہ مجھ سا نہیں لاغر کوئی
مجھ کو سمجھے ہے تیرا موئے کمر اپنا سا
وادیِ قیس کی جانب جو کہیں جا نکلے
ہمیں معلوم ہوا دور سے گھر اپنا سا

غزل (۷) کے آخری شعر میں شیرِ خدا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ شیرِ خدا حضرت علی کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا نام اسداللہ تھا۔ اور اسی کا ترجمہ شیرِ خدا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عارفؔ کو حضرت علی کی ذات والا سے گہری عقیدت تھی۔ یہ بات ہمیں غالبؔ کے مسلک میں بھی ملتی ہے اور اس اعتبار سے دونوں کا مسلک ایک دوسرے سے قریب ہے۔

غزل (۸) میں بھی ایک سے زیادہ بلکہ پانچ مطلعے ہیں، یہ پنجتن کی مناسبت سے بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان میں صرف دو مطلعے حضرت علی کی شان میں ہیں۔ یا پھر مقطعے کے لیے حضرات آلِ عبا کا یہاں ذکر اور سجدۂ احترام کی بات زبان پر آئی ہے۔ غزل کی فضا مذہبی تقدس سے آراستہ نہیں۔ دو مطلعے اور ایک مقطع ہی ایک خاص انداز تقدس رکھتے ہیں۔ غزل (۸) کے تیسرے شعر میں 'بڑھا' کے بجائے 'چڑھا' ہونا چاہیے۔

کیوں یقیں ،تم کو(نہیں) عہدِ وفا پر میرے
تم تصور مجھے کرتے ہو مگر اپنا سا
شب کو، کیا ہم سے ہوا، جو دمِ رخصت عارفؔ
حال ان کا بھی ہوا وقتِ سحر اپنا سا

(۱۰)

بخت وہ میرا ہوا سچ تو ہے کیونکر ہوگا
جو سیاہی میں تری زلف کے ہمسر ہوگا
لوحِ محفوظ میں کس جائے بُرا ہے یارب
کاہے پر اور لکھا میرا مقدّر ہوگا
چارمی چرخ پہ بھی رہیے تو ہے امن کہاں
ایک سے ایک سوا ان میں ستم گر ہوگا
ہم کو وحشت نے بیاباں میں بھی ٹکنے نہ دیا
میں نے جانا تھا ہمیشہ کو میرا گھر ہوگا
عشق پردے میں خرد کے نہیں چھپتا عارفؔ
اس میں ہوگا وہی جو عقل سے باہر ہوگا

(۱۱)

حالِ دل کس سے کہوں میں کسے باور ہوگا
آپ لرزے گا جہاں جب کہ یہ مُضطر ہوگا
خضر کب دشتِ خطرناک سے بھاگا ہے کہیں
آگیا اس کو نظر آج مرا گھر ہوگا
جانبِ کعبہ ہو گر دہر تو سجدہ نہ کروں
کہیں مجھ سا نہ جہاں میں کوئی کافر ہوگا
چرخ کب چاہے ہے گھر میں میرے آنا تیرا
شب (ہی) رہ وے گی اگر روز مقرر ہوگا
حشر میں کام ہے عارفؔ ہمیں اس ساقی سے
چومتا جس کی کفِ پا لبِ ساغر ہوگا

(۱۲)

وہ حال عشق میں رہتا ہے تیرے شیدا کا
کلیجہ دیکھ کے پھٹتا ہے جس کو اعدا کا
لگاؤ سے بھی اسے خط کے عار ہے ایسا
لکھا نہ حال تیرے عارضِ مُصفّا کا
ازل سے کان میں ڈالا ہے جس کو عزت نے
وہ ہی تو حلقہ ہے، رندانِ بادہ پیا کا
تمھارے ہجر میں گو ہووے بسترِ مخمل
ولے اٹھے تھے مزا ریزہ ہائے مینا کا
یہ لوگ منہ پہ ہیں کچھ اور پیچھے کچھ عارفؔ
بیان کیجیے کیا، حال جو ہے دنیا کا

(۱۳)

عجب ہے رنگ ترے لعل روح افزا کا
خوشی سے سرخ ہے گویا کہ منہ مسیحا کا
تفِ دروں نے جلا کر کیا ہے خاک اُسے
ہوا ہے دل میں گزر جب کسی تمنا کا
اگر ہے اصل میں ہم رنگ، رنگِ رخ یہ بھی
اڑا ہے خواب جو یوں دیدۂ زلیخا کا
تیرے لیے میری وحشت ہے باعثِ شہرت
ہوا جہاں میں ہے مجنوں سے نام لیلیٰ کا

طلسمِ ضبط سے روکا ہے دیدۂ تر کو — وگرنہ اس میں ہے سرمایہ ہفت دریا کا
غلامی آپ کی کرتا ہوں حضرتِ یوسف — جو جلوہ دیکھ سکو اس کے روئے زیبا کا
خمیر میرا ہوا ہے شراب میں عارفؔ — نہ کیونکہ خونِ جگر میں مزا ہو صہبا کا

(۱۴)

زور پر آہ تھی اور نالۂ شب گیر بھی تھا — مانتا ہم کو کبھی یہ فلکِ پیر بھی تھا
حور کا دھیان رہا وقت شہادت سب کو — محو صورت پہ تری میں دمِ تکبیر بھی تھا
در بدر مجھ کو کیا در سے اٹھا کر اپنے — تیرا عاشق تو میں تھا شہر میں تشہیر بھی تھا
بندگی قہر ہے الزام اٹھاتے ہی بنی — حشر میں پیش اگرچہ خطِ تقدیر بھی تھا
نقلِ محفل مجھے مدّت میں وہ سمجھے عارفؔ — رات کو بزم میں یہ موردِ تقصیر بھی تھا

(۱۵)

آگ کو جو کہ کرے پھونک سے عالم ٹھنڈا — اس سے بھی ہو تفِ غم میں نہ میرا دل ٹھنڈا
تابِ خورشید سے بیزار ہے لیلیٰ، مجنوں — اک دمِ سرد وہ بھر جس سے ہو محمل ٹھنڈا
دور سے تیر ہی مارا نہ نکالا خنجر — سانس پھر کیوں نہ بھروں میں دمِ بسمل ٹھنڈا
دھوپ میں پھر کوئی آئے گا تماشے کو نہیں — وقت ہونے دے ذرا اے بتِ قاتل ٹھنڈا
دور رکھ جنبشِ دامانِ بیاں سے عارفؔ — شمعِ ایماں کو نہ کچھ کہیں غافل ٹھنڈا

(۱۶)

قتل کرنے میں میرے قاتل تامل کیوں ہوا — اور کاموں میں ہو پر اس میں تغافل کیوں ہوا
کیا ہوا کھانے کو صحرا میں کوئی آتا نہیں — گھر میرے آتے ہوئے ان کو تامّل کیوں ہوا
آمدِ خط کا بھی غم لکھا تھا قسمت میں میری — زلف کیا پیدا نہ تھی میں محوِ کاکُل کیوں ہوا
چرخ پر رہنے لگے کیوں عرشِ اعلیٰ چھوڑ کر — آہ دل ہو کر ترقی پر تنزل کیوں ہوا
بزم میں کس کی زباں پر نام کس کا آگیا — رنگ چہرے کا ترے عارفؔ تبدل کیوں ہوا

(۱۷)

بیٹھا ہوں آستاں پہ تمھارے اڑا ہوا — ہے اب تو سنگِ در سے مرا سر لڑا ہوا

غزل (۱۳) میں پانچواں شعر غالبؔ کے اس شعر سے ملتا جلتا ہے جس کا دوسرا مصرع یہ ہے: ''میری نگاہ میں ہے جمع وخرچ دریا کا''۔

تاچند، امتحاں دلِ بے اعتبار کا　رہتا ہے یہ مکان ہمیشہ اُجڑا ہوا
وہ ساکنانِ چرخِ بریں (کو) نہیں نصیب　کرتا ہوں، سیر، جو میں، اکیلا پڑا ہوا
یارب شراب خوار تو مفلس کبھی نہ ہو　انگور سونگھتا ہوں میں پہروں سڑا ہوا
عارفؔ بزرگ و خورد برابر ہیں اصل میں　ظاہر کہ اعتبار سے چھوٹا بڑا ہوا

(۱۸)

ہوگیا ہے رہ کے زنگ آلود، ناوکِ یار کا　زخمِ دل پر کیوں گمان ہے مرہمِ زنگار کا
تیغ زن ہے اب وہ عالم ہے نگاہِ یار کا　سحر پردازی ہے رکھنا آنکھ میں تلوار کا
خواب غم میں اور کیا ہو دیدۂ بیدار کا　رنگ یہ بھی ہوگیا یارب میرے رخسار کا
ڈھونڈتا ہی رہ گیا شب مجھ کو درباں یار کا　لاغری میں رستہ سوجھا روزنِ دیوار کا
جی میں آتا ہے کہ کیجیے ایک وہ مطلع رقم　یک قلم جس میں بیاں ہو خوبیِ دلدار کا

ردیف (ک)

(۱۹)

نہ کیوں ہو اشکِ چشمِ عاشقاں پاک　کہ عِندالشرح ہے آبِ رواں پاک
کبھو چوما جو میں نے در تو اس نے　کیا دھلواکے سنگِ آستاں پاک
موئے جو خلق گر کر ترے غم میں　نہیں عالم میں اب کوئی کنواں پاک
نہ رکھ تو وہم میری طرف سے　محبت ہے مجھے اے بدگماں پاک
خبر سن کر میرے مرنے کی عارفؔ　وہ فرمانے لگے خس کم جہاں پاک

ردیف (ل)

(۲۰)

ہوکے زخمی عاشقانِ زار کے پابوسِ گل　رہروانِ وادیِ پُرخار کے پابوسِ گل
پاؤں وہ دھوتا ہے تو بنتا ہے وہ پانی گلاب　واقعی ہیں اس گلِ بے خار کے پابوسِ گل
خاک پر مری قدم رکھے تو خوش ہوجائے روح　میری قربت کے لیے دل دار کے پابوسِ گل

غزل (۱۸) میں پانچ مطلع ہیں۔ پہلے چار نقل کردیے گئے ہیں۔ پانچویں مطلعے سے ایک اور غزل شروع ہوتی ہے اور چھبیس شعروں کے بعد پھر ایک نیا مطلع آگیا اور مطلع نگاری کا سلسلہ پانچ مطلعوں تک جاری رہا اور چھٹے مطلعے سے چوبیس شعر کی ایک غزل شروع ہوجاتی ہے۔ اور پانچویں شعر پر ختم ہوتی ہے۔

جب گلال آنکھوں سے پھینکا پاؤں رنگیں ہو گئے
فیض سے اس دیدۂ خونبار کے پابوسِ گل
پاؤں جس دم اُس کے سونگھے روح تازہ ہو گئی
کیا کہوں سچ مچ ہیں عارفؔ یار کے پابوسِ گل

(۲۱)

مجھ کو دکھلا دو اگر دو چار کے پابوس گل
ہیں تو رنگیں ہو کے میرے یار کے پابوسِ گل
کیا ترے کوچے سے آتی ہے یہ اے رشکِ چمن
تو نے چومے عندلیب زار کے پابوسِ گل
باغباں کیوں ہم گلوں کو اپنی آنکھوں سے ملیں
ہیں ہمارے اس پری رخسار کے پابوسِ گل
پھرتے پھرتے جستجوئے یار سے ہو کر فگار
عاشقانِ خشک تر، از کار کے پابوسِ گل
کم نہیں ہے رنگ بھی شوخی سے اس کی چال میں
کیوں نہ ہو اس آتشیں رخسار کے پابوسِ گل

(۲۲)

فلک جو دیکھے میرے رشکِ حور کی قندیل
نہ آفتاب کو پھر سمجھے، نور کی قندیل
حباب بحر میں گر عکسِ رخ پڑے تیرا
اثر سے اس کی وہ ہو جائے نور کی قندیل
مبادا حد سے کہیں شعلہ زن ہو آتشِ غم
بھڑک اٹھے گی دلِ ناصبور کی قندیل
وہی تو ہے درِ دار العدالتِ یزداں
جہاں جلے گی سرِ پُرغرور کی قندیل
سبوئے مے نظر آئے جو نشے میں عارفؔ
تو سمجھے ہم کہ یہ ہے بزمِ نور کی قندیل

(۲۳)

معلوم آج تک ہے کسے اوجِ جاہِ دل
پھر سیرِ عرش ہووے جو پہنچے نگاہِ دل
آنکھوں کی راہ وہ میرے دل میں اُتر گئے
کیا جلد مل گئی انھیں آسان راہِ دل
رہوے مبارک ان کو شبستانِ زلفِ یار
بہتر نہیں ہے اس کے سوا خواب گاہِ دل
کیا دیکھنا ضرور ہے سینہ کو چھوڑ کر
صورت یہی عیاں (ہے) میری جاں پناہِ دل
عارفؔ عصائے پیر سمجھ لے اسے ہی تو
گر دل نہیں رہا تو غنیمت ہے آہِ دل

غزل (۲۰) میں کل سترہ شعر ہیں۔ اس کے بعد غزل ثانی کے عنوان سے انیس شعروں کی ایک اور غزل شروع کی گئی ہے۔ جس کا مطلع غزل بیس میں پیش ہے۔ اس غزل کے بعد آٹھ، دو-دو شعر کے قطعے آئے ہیں جو اسی زمین اور اسی ردیف وقافیہ میں ہیں۔ آخر کا شعر یہ ہے:

گر نہ ہوتے پاؤں تو کس رنگ سے آتی بہار
نوبہار گلشنِ گلزار کے پابوس گل

(۲۴)

لالے کی طرح رشک سے لگا تا ہے داغ گل　　　حلقے کا ترے دیکھیے جب رشکِ باغ گل
ہیں محو نکہتِ عرقِ روئے یار کے　　　پھرتا ہے تری بو سے ہمارا دماغ گل
شبنم ہے اشک ریز کہ دو چار دن کے بعد　　　ڈھونڈا نہ جاسکے گا یہ ترا سراغ گل
تری ہوائے عشق لگی غیرتِ چمن　　　کیونکر نہ ہووے عقل کا میری چراغ گل
سامانِ بزم عیش ہیں پوچھے تو مجھ سے پوچھ　　　عارف شراب بادہ صراحی ایاغ گل

ردیف (م)

(۲۵)

وہ کار کیا ضرور کریں جو ریا سے ہم　　　بندوں سے کیوں ڈریں نہ ڈریں جب خدا سے ہم
کیوں دشمنی کے غم میں رہیں کر کے دوستی　　　بیگانہ وار رہتے ہیں ہر آشنا سے ہم
رنج و خوشی میں ہے جو ہم کاہش و نمود　　　رہتے ہیں اعتدال پہ خوف و رجا سے ہم
جینے کی کوئی شکل نہ تھی ہجرِ یار میں　　　کیا جانے صاف بچ گئے کس کی دعا سے ہم
رہیے نہ اس عذاب میں عارف بقولِ میر　　　لکھتے ہیں جب کہ ہوتے ہیں واقف بلا سے ہم

ردیف (ن)

(۲۶)

کیا کہیں ہم کہ عشق میں کیا کھاتے ہیں　　　کوئی دن اور ہیں دنیا کی ہوا کھاتے ہیں
ہو کے مفلس نہ رہی زادِ سفر کی حاجت　　　ٹھوکریں راہ میں بے برگ ونوا کھاتے ہیں
ہے دوا زہرِ مریضانِ محبت کے لیے　　　کچھ سمجھ کر ترے بیمار دوا کھاتے ہیں
ہرزہ روزی سے مرے گھر کا ہے اب یہ عالم　　　دن کو یاں رات کا ہوگا جو بچا کھاتے ہیں

غزل (۲۶) کے مقطعے میں ''آلِ عبا'' کا لفظ آیا ہے۔ ایک مرتبہ کافروں سے اس مسئلے پر باقاعدہ کہا سنی ہوئی اور نوبت یہاں تک آپہنچی کہ ان کا کون کون ہے اور حضور کا اپنا کون ہے تو آپ نے اپنی چادر میں اپنے ساتھ حضرت علی، حضرت فاطمہ اور ان کے دونوں بیٹوں حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین کو بٹھلایا اور یہ کہا کہ ہم پانچ ایک ہیں کیوں کہ آپ نے چادر اڑھائی تھی۔ اور چادر عزت کی اور اپنائیت کی علامت ہے۔ اس لیے پنجتن اور آل عبا کا تصور مسلمانوں میں آگیا۔ اور حضرت فاطمہ سے حضرت علی کی جو اولاد ہے وہ آلِ عبا کہلاتی ہے۔

غمِ روزی نہ رہا ہم کو جہاں میں عارفؔ رات دن جب سے غمِ آلِ عبا کھاتے ہیں

(۲۷)

لذتِ درد سے محفوظ وہ ناکام نہیں جس کو بیتابیِ دل باعثِ آرام نہیں
جب کہ مرنے کے سوا عشق کا انجام نہیں پھر بتہِ خاک مجھے کس لیے آرام نہیں
اس پہ بھی سبزیِ لب آگئی غالب شاید اب جو پہلی سی ترِی تلخیٔ دُشنام نہیں
جان و دل لے کے نہ اب پہنچے گا قاصد اپنا کوئی شے پاس مرے قابلِ انعام نہیں
لوگ ہم ہی سے اڑاویں تو اڑاویں عارفؔ (مقطع) طرز یہ خاص ہے اب تک تو کہیں عام نہیں

(۲۸)

وہ پوچھتے ہیں جو جم کے برسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
کہ لرزے رو رو، ہے کس کے ڈر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
رہے ہے بَرَمن کا میرے دشمن رہے ہے بدخواہ میرے گھر کا
نہ ان دنوں میں ہے دل کے رہزن فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
ہماری دیکھیں جو بے قراری ہماری دیکھیں جو اشک باری
گریں سبھوں کی نہ کیوں نظر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
وہ حال ہے میرے غم کدے کا کہ مارے ظلمت کے رہوے غائب
بہ روزِ روشن میری نظر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
گرے جو اُس پرتو پھر نہ پاوے جو برسے اس پرتو خون ہووے
ڈرے نہ کس طرح میرے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
غضب کی اس کی وہ ہے علامت اس کی رحمت کی یہ نشانی
جو دیکھیے چشم دیدہ ور سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
مزہ ہے بادہ کشی کا عارفؔ کہ لحظہ لحظہ دکھائی دیوے
کبھو اِدھر سے کبھو اُدھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

غزل (۲۸) شاہ نصیر اور ظفر کے رنگ میں ہے۔ عارفؔ نے استادانہ اندازِ بیان کو اپنایا ہے اور یہ غزل اپنے مخصوص رنگ کے اعتبار سے شاہ نصیر، ذوقؔ اور ظفرؔ جیسے شاعروں کے اسلوب کی خوبصورت نمائندگی کرتی ہے۔

(۲۹)

دوہرے ہوئے جو شرم سے وہ پیچ و تاب میں
حسن ان کا ہوگیا ہے دوبالا حجاب میں

کرنی پڑی نہ سعی ہمیں گھر کے باب میں
قدرت سے ہے خراب جہانِ خراب میں

بجلی سمجھ کے چونک پڑوں، ہوں وہ بدنصیب
وہ شوخ اتفاق سے آئے جو خواب میں

ہم جی اٹھے نہ قبر میں گو، تر کفن ہوا
ان کے عرق کی بو نہیں ہرگز گلاب میں

عارفؔ نہ پی شراب تجھے اختیار ہے
پر ہم تو کہہ کے ہوگئے داخل ثواب میں

(۳۰)

کیا ڈھونڈتا ہوں مجمعِ یوم الحساب میں
دامن عیاں ہے پیراہنِ بوتراب میں

تا ایک وضع پر رہوں دائم عذاب میں
ضد سے میری زمانہ نہیں انقلاب میں

اپنے بھی دیکھنے سے نہ جاتا رہوں کہیں
رہنے دو روئے ہوش ربا کو نقاب میں

کیا ہو تصورِ لبِ جاناں سے فائدہ
حاصل جو کوئی آبِ بقا ہووے خواب میں

اک دم میں عرش پر ہے ہمارا سمندِ فکر
ہے دیر پاؤں رکھنے کی عارفؔ رکاب میں

(۳۱)

تمھیں کھنچوا کے بلانا ہمیں منظور نہیں
ورنہ یہ جاذبۂ عشق سے کچھ دور نہیں

چارہ گر خبر ہے کچھ میری جراحت کا علاج
یہاں یہی غم ہے کہ اب تک کوئی ناسور نہیں

زلف و رخ رہنے لگے جب سے ترے زیرِ نقاب
شب میں ظلمت وہ نہیں صبح میں وہ نور نہیں

اور الٹی ہوا اُسے دیکھ کے جب دل میں جلن
تو جراحت کو مضر مرہم کافور نہیں

کوئی دم لینے دے تلوار بہ حقِ عارفؔ
تو نے لوگوں سے سنا وہ کہ جو منظور نہیں

(۳۲)

چھیلیاں صیاد نے ہیں خوب کس کے تیلیاں
کوز ہو کر کس طرح ٹوٹیں قفس کی تیلیاں

جب سے یہ خدمت انھوں نے اپنے گھر کی دی مجھے
ذکر کیا ہے واں پڑی رہ دیں ہوس کی تیلیاں

دیکھ کر جاروب کش مجھ پر جو چشمک زن ہوا
کر دیا آنکھوں میں ہم نے بوالہوس کی تیلیاں

حق میں مرغِ ناتواں کے ہے وہ فولادی قفس
اس کی ہوں بالفرض اگر پائے مگس کی تیلیاں

پہلی غزلیں اس زمیں میں یک قلم بیکار ہیں
ہوویں گل کر خاک عارفؔ سو برس کی تیلیاں

(۳۳)

زیبا نہیں ہے خارِ مشقت کے پاؤں میں
ہوتی ہے کفش طالب راحت کے پاؤں میں

کچھ جانتے نہیں ہیں بجز جستجوئے نیست
چکر سوا ہے اہلِ محبت کے پاؤں میں

پہنچا وہ جب کہ عرش پہ نعلین بھی نہ تھی
اس بادشاہِ ملکِ نبوت کے پاؤں میں

پایا نہ جب قدم کو تیرے قابل نثار
ہم سر دیتے ہیں مارے خجالت کے پاؤں میں

عارفؔ لگایا چاہیے آنکھوں میں وہ اگر
لگ جائے خاک پیرِ طریقت کے پاؤں میں

(۳۴)

جو تجھے کہنا ہے کہہ لے آج تک ہے تر زباں
چل سکے گی کل کو ہو کر خشک پھر کیونکر زباں

کس سراپا نور کا لب تشنۂ دیدار ہے
شیخ کی منہ سے نکل آئی ہے جو، باہر زباں

حرفِ مقصد کہتے ہی اس میں بھی عقدہ پڑ گیا
بات کرتا ہوں تو لُکنت کرتی ہے اکثر زباں

کیا زبانوں کا خزانہ آ گیا ہے اُس کے ہاتھ
جو بدلتا دم بہ دم ہے وہ بتِ کافر زباں

کیا کروں عارفؔ تری شیریں کلامی کا بیاں
شہد لب سے بن کے برسائے ہے یہ شکر زباں

(۳۶)

اب کوئے یار میں ترا شاید گزر نہیں
پہلی سی بات تجھ میں نسیمِ سحر نہیں

ہاتھوں کا دھو لہو تجھے حاکم کا ڈر نہیں
قاتلِ حنا کی طرح، یہ خونِ جگر نہیں

دو دو پہر فراق میں کیونکر ہو زندگی
جینے کا لطف جب بُتِ رشکِ قمر نہیں

موتی کہاں سے روز کروں تم پہ میں نثار
آخر یہ چشمِ تر کوئی گنجِ گہر نہیں

عارفؔ بتوں کے عشق میں ہو نفع یا ضرر
ایمان تک تو جائیے کوئی ضرر نہیں

(۳۷)

سچ ہے کہ آہِ سرد مری بے اثر نہیں
پتھر کو جھاڑیے تو نکلتا شرر نہیں

اوروں کو ہو تو ہو ہمیں مرنے سے ڈر نہیں
خط لے کے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں

ہر چند مجھ میں کوئی کمال و ہنر نہیں
ہر چرخِ کینہ دوز سے میں بے خطر نہیں

اٹھتا قدم جو آگے کو اب راہبر نہیں
پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں

دل لے کے دے وہ بوسہ یہ ہے مقتضائے سن
قیمت ہے اس کی کیا اسے اب تک خبر نہیں

غزل پینتیس (35) کی قرأت ممکن نہیں ہو سکی۔

بے اختیار روتے ہیں پڑھ پڑھ کے مرثیے
الفت میں تیری گر یہ مرا پردہ در نہیں
عرشِ بریں پہ جاکے رُکیں شوق کے قدم
عارفؔ یہ آشیانہ خیرالبشر نہیں

(۳۸)

نازک ہو تم تو بندہ بھی کم ناتواں نہیں
بوسے کا میرے آپ کے رخ پر نشاں نہیں
اہلِ ہنر جہاں میں نہیں لذت آشنا
مقسوم میں ہماں کے بجز اُستخواں نہیں
کیوں جانے چپ ہوں داورِ محشر کے سامنے
ظالم وگرنہ کیا میرے منہ میں زباں نہیں
کرتے تمھارے نامے کو ہم حرزِ جاں مگر
عاشق ہیں ہم عزیز ہمیں اپنی جاں نہیں
کُنجِ لحد میں رکھتے ہو راحت کی تم امید
عارفؔ مگر زمیں کے تلے آسماں نہیں

(۳۹)

آگ اُس دل کو محبت میں جو بیتاب نہیں
خاک اُس چشم میں جو عشق میں پُر آب نہیں
چاندنی میں وہ نکلتے شبِ مہتاب نہیں
دھوپ کی طرح سے اس کی بھی انھیں تاب نہیں
ہوچکا خرچ مگر عشق میں سرمایۂ دل
دیدۂ تر سے جو وہ ریزشِ خوناب نہیں
کیوں نہ کوثر پہ کھڑا خاک اُڑاؤں سر پر
اس کی تہ ٹوٹ گئی اور میں سیراب نہیں
رشک میں اب مجھے یہ وہم ہوا ہے عارفؔ
کیا سبب ہے کہ ملائک کو خور و خواب نہیں

(۴۰)

یہ تو کیونکر کہوں عشاق کے گھر خاک نہیں
سر پہ کیا اپنے اڑاتے ہیں اگر خاک نہیں
طعنۂ تابِ غم ہجر کو موقوف کرو
ہوگئے خاک یہاں غم کو خبر خاک نہیں
کیوں ہمیں دیکھ کے گھبرا گئے تم اے صاحب
تم تو کہتے تھے محبت میں اثر خاک نہیں
دیکھ کر بُت تو، جو لاحول پڑھے ہے زاہد
حیف اے مردِ خدا تجھ کو نظر خاک نہیں
خوار کس واسطے عارفؔ تجھے رکھتا ہے فلک
غور سے دیکھ تو لو جھ میں ہنر خاک نہیں

(۴۱)

سوزشِ غم سے اڑا جب دل بے تاب نہیں
ہم نے جانا کہ یہ کچھ اور ہے سیماب نہیں
نقدِ شادی بھی خریدار کے دل سے نکلی
جنسِ غم، عشق کے بازار میں نایاب نہیں
چشم بدور تجھے کہنے کی پھر کیا حاجت
خلق کو جب کہ تیرے دیکھنے کی تاب نہیں
دیکھ کر اُس کو جو پھر بھی مجھے سمجھاتے ہیں
میرے دشمن ہیں حقیقت میں یہ احباب نہیں

وجہ کیا ہے جو وہ لکیر تجھے دے دیں عارفؔ — کشورِ دل ہے کوئی صوبۂ پنجاب نہیں

(۴۲)

عاشق ہوئے تھے جو کہیں رسوا نہیں ہوں میں — میں مر گیا ہوں آپ پہ، زندہ نہیں ہوں میں
کیا بے خودی میں خدمتِ میخانہ ہو سکے — پیرِ مغاں سے طالبِ صہبا نہیں ہوں میں
ساقی ہنسے ہے کیا مجھے دو تین دے کے جام — پی کر خُم شراب ہی بہکا نہیں ہوں میں
کیا گھٹ کے لاغری سے حقیقت میں بڑھ گیا — نظروں میں جو کسی کی سماتا نہیں ہوں میں
عارفؔ میرے کلام کو انصاف کر کے دیکھ — فنِ سخن میں ہمسرِ سودا نہیں ہوں میں

(۴۳)

آئینہ بھی نہیں نگہِ یار بھی نہیں — پوچھے ہی جب نہ کوئی تو کچھ بار بھی نہیں
ضد سے، میری رہے ہے، وہ ایسے مکان میں — جس میں کہ ایک روزنِ دیوار بھی نہیں
پھر دل کو کس علاقے سے ہم شادماں رکھیں — وہ تو ہمارے درپئے آزار بھی نہیں
کہتے ہیں دل اچھال کے وہ مثلِ گوئے (کہ) — کچھ کام کا نہیں ہے تو بے کار بھی نہیں
عارفؔ سے پھر بھلا انھیں کیوں احتراز ہو؟ — گر متقی نہیں ہے تو بدکار بھی نہیں

ردیف (و)

(۴۴)

ہے شوقِ دید خلق کو تو جلوہ گر نہ ہو — خالق پہ مجھ کو ڈر ہے کسی کی نظر نہ ہو
کرتا ہے بعدِ ہر ستم اک لطف تا کہیں — مظلوم ہو کے میری دعا میں اثر نہ ہو
تحت الثریٰ کی لائے خبر گر وہ ہے خراب — یہ کون سی صفت ہے کہ دیوار و در نہ ہو
جس چیز پر کہ (داغ) دکھائی دیا مجھے — دھوکا یہ ہوگیا کہ وہ میرا جگر نہ ہو
آتی ہے بو کباب کی عارفؔ خبر تو لے — تیرا ہی سوزِ عشق سے بُھنتا جگر نہ ہو

ردیف (ھ)

(۴۵)

پیوند بسکہ ہے اسے اس سنگِ در کے ساتھ — سر سجدہ سے اٹھے تو اٹھاتا ہے سر کے ساتھ
دنیا میں اتفاق نہیں ہم تو کون ہیں — موسیٰ سے آدمی کی نہ گزری خضر کے ساتھ

غزل (۴۳) میں مطلعے کا پہلا مصرع قیاسی طور پر قلم بند کیا گیا ہے۔ مخطوطے سے اس ضمن میں کوئی خاص رہنمائی نہیں ہوئی۔

اب اور کس کو تم سے توقع رہے خضر | پہلے کیا ہے آپ نے کیا ہم سفر کے ساتھ
خسرو یہ زندگی کی حلاوت ہوئی تمام | شیریں کے ساتھ عشق کیا، یا شکر کے ساتھ
عارفؔ نہ در ہے اور نہ دیوار ہی کوئی؟ | سر پھوڑتا پھرے جو یہ دیوار و در کے ساتھ

ردیف (ی)

(۴۶)

یوں تو عالم میں نگہ آپ کی خوں ریز رہی | لیکن اوروں سے سوا مجھ پہ چُھری تیز رہی
مَرَضِ عشق ہے آخر کو ہے مرنا ہی مجھے | ایسے بیمار کو کیا حاجتِ پرہیز رہی
دل لیے پھر بھی وہی پیچ چلے جاتے ہیں | ہم سے سیدھی نہ تری زلفِ دل آویز رہی
سرخ رومال رکھا چشم جو خوں بار ہوئی | دل میں ہر بات مری مصلحت آمیز رہی
بادشاہ ہی یہ ہو مغرور کوئی کیا عارفؔ | نہ وہ چنگیز نہ وہ شوکتِ چنگیز رہی

(۴۷)

کرکے شوخی کیوں تیری ہمسر بجلی | جو گرے مجھ پہ ترے قد کے برابر بجلی
کبھو ہنس ہنس کے وہ باتیں جو کیا کرتے ہیں | بذلہ گو کہتے ہیں برسائے ہے گوہر بجلی
تیرا دیدار ہے تسکیں دہِ جانِ مضطر | رہ وے بیتاب ترے کار کی کیونکر بجلی
ناتوانی کا میری اس پہ جو ہوجائے اثر | ضعف سے اٹھ نہ سکے پھر کبھو گر کر بجلی
چین ایک دم نہیں بیتابیٔ دل سے عارفؔ | کس نے رکھ دی ہے میرے سینے کے اندر بجلی

(۴۸)

وہ دن گئے کہ اس کی بتِ کافر سے راہ تھی | اس کی گلی کی خاک مری سجدہ گاہ تھی
وہ بات ہے کہاں لبِ شیریں میں آپ کے | تھا وہ بھی رنگ جب ہمیں بوسہ کی چاہ تھی
اب رخ سے تم نقاب اٹھاؤ تو فائدہ | وہ دن گئے کہ اپنے میں تاب نگاہ تھی
عالم میں اب وہ نام کو باقی نہیں ہیں ہم | سابق میں حسن و عشق سے سو رسم و راہ تھی
وہ دن گئے جو لیتے تھے ان کے قدم پہ دم | عارفؔ جب ان کے رخ پہ وہ پہلی نگاہ تھی

(۴۹)

جب تک انھوں کی شرم سے نیچی نگاہ تھی | آسودگانِ خاک کی حالت تباہ تھی

قاتل نے کیا کہوں کہ اٹھا دی نقابِ رخ
سب خلق ورنہ قتل کی مرے گواہ تھی
کیوں آئے گرم تم مری تربت پہ لے کے پھول
خود وہ بھی جل گئی جو اُگی کچھ گیاہ تھی
آنکھیں ہماری رونے سے کیا ہوگئیں سپید
گویا سرشت میں یہی پُتلی سیاہ تھی
عارفؔ لگا کے منہ اسے شب خود ہوئے خراب
ہے سچ تو یہ کہ دخترِ رز بے گناہ تھی

(۵۰)

بہا جو یونہی کوئی روز، چشم تر پانی
مٹا کے رہ دے گا آخر کو میرا گھر پانی
عجب نہیں ہے جو تارِ نظر کو پالیویں
ولے محال ہے اس شوخ کی کمر، پانی
لگادے سوزِ نفس اتنا آگے دریا میں
ہمارے حلق کو کب کر سکے ہے تر پانی
بڑھا دیا اُسے دنیا نے اپنی زینت سے
وگرنہ اصل میں ہے دامن گہر پانی
ہمیں سے پوچھ ہمارے علاج کی تدبیر
گلے میں اب جو اٹکتا ہے بیشتر پانی
ہمارے دیدۂ تر کا خیال کر لیجو
ملے نہ راہ میں تجھ کو جو نامہ بر پانی
فریب ہستیٔ موہوم میں نہ آ عارفؔ
کہ تو سراب کو سمجھا ہے بے خبر پانی

(۵۱)

خوش شبِ ہجراں میں مجھ کو (پائے) کیونکر چاندنی
جب برص سے ہو نظر میں میری بدتر چاندنی
زور اس کی انجمن میں ہے وہ اک نازک مزاج
تر نہ ہوجاوے کہیں اے دیدۂ تر چاندنی
اس کی بزمِ عیش کا شاید کہ وہ فراش ہے
جو بچھاتا رات کو ہے ماہِ انور چاندنی
عطر آگیں ہو، ہوا سے اس کے کوچے کی نسیم
بزم کی اس کے اگر جھاڑیں اٹھا کر چاندنی
کرتے ہیں حد سے سوا رفعت سے عارفؔ مے کشی
دیکھ لے تو رات کو ہوتی ہے گھر گھر چاندنی

(۵۲)

تیری محفل میں بچھی (ہے) وہ ستم گر چاندنی
چاند کی کب ہوسکے اس کے برابر چاندنی
کلبۂ تاریک میں زخمی تیرا محفوظ ہے
اب اگر آوے تو آوے یاں مقرر چاندنی
ہے طلسم حرف ومعنی میرے عالم میں عجب
جس میں باہر ہے، اندھیرا اور اندر چاندنی
گر اندھیرا ہو تو جاؤں کوچۂ دلدار میں
کررہی ہے آج کیا ہی ظلم مجھ پر چاندنی
میں شبِ مہتاب میں روؤں اگر عارفؔ کبھو
کام سے جاتی رہے پانی میں گھر کر چاندنی

(۵۳)

نہ لیجو رشکِ چمن ہاتھ میں چھڑی گل کی
چبھے گی پنجۂ نازک میں پنکھڑی گُل کی

کہیں نہ دام میں پھنس جائے تو بھی اے بلبل
تو اپنی فکر میں رہ تجھ کو کیا پڑی گُل کی

سوا لچک کے نہ پہنچے کمر میں کچھ صدمہ
گلے میں ڈالتے ہو کس لیے لڑی گُل کی

چمن کو وہ نگہِ مست سے اگر دیکھے
شراب ساری شرابوں سے ہو کڑی گُل کی

انھوں کی جنبشِ دامن سے باغ میں عارفؔ
ہوا لگی جو سحر گرد غم چھڑی گُل کی

(۵۴)

نہ اپنی مشکل ذرا مجھ کو آ کے دکھلائی
تمام روز مجھے خوب راہ دکھلائی

فلک پہ خلق کو تارے نظر لگے آنے
انھوں نے دن کو جو زلفِ سیاہ دکھلائی

غضب ہے نام فقط اشتیاق کا آنا
اجل نے تم سے سوا مجھ کو راہ دکھلائی

وہ بدگماں ہوں میں خود اس کا ہو گیا دشمن
مجھے کسی نے جو حالت تباہ دکھلائی

کیا تھا وعدہ لے آنے کا محو نے عارفؔ
تمام روز مجھے خوب راہ دکھلائی

ردیف (ے)

(۵۵)

مجھ کو اور آپ کو عالم میں نہ رسوا کیجیے
آپ ہو رہیے مرے یا مجھے اپنا کیجیے

نا تمام اُس کو نہ خط پہنچے تو پھر کیا کیجے
شوق کہتا ہے کہ برسوں یونہی لکھا کیجیے

چرخِ اخضر سے بجز قطعِ نظر کیا کیجے؟
آدمی ہووے جو دشمن تو مداوا کیجیے

آپ یہ مر کے رہا کون سا رتبہ باقی
کہ حریفوں کی طرح جس کی تمنا کیجیے

گھر کے لٹنے ہی سے تم عشق میں غش ہو عارفؔ
اور کیا کیا ابھی وہ کرتے ہیں دیکھا کیجیے

(۵۶)

دیکھیے عالم میں ہیں صابر کہیں انساں مجھ سے
کبھی شکوہ بھی سنا گردشِ دوراں ہم سے

ربط رکھنا ہے اگر آپ کو پنہاں ہم سے
تو یہ لے جاؤں ہمارا دلِ ناداں ہم سے

جس کے ہر تار میں لپٹا نہ ہو خونابۂ دل
ساتھ دریا کے رہے پارۂ داماں ہم سے

دم بدم شادیِ اندوہ سے دل بڑھتا ہے
تم یے جاؤ لہو دیدۂ گریاں ہم سے

ہنستے ہیں شکل کو ہم دیکھ کے اس کی عارفؔ
مانگتا ہے جو ہمارا کوئی دیواں ہم سے

(۵۷)

بزمِ دلدار میں کیا کہیے کہ کیا ہوتا ہے
پوچھیے کچھ نہ حقیقت کہ گلہ ہوتا ہے

ہوں یہ بے پردہ بھی تو کیا کوئی انھیں دیکھ سکے
جلوۂ حسنِ بتاں ہوش ربا ہوتا ہے

نہیں ممکن میرا، اس نیم نگہ سے مرنا
اس قدر زہر سے، صاحب مجھے کیا ہوتا ہے

کیا تعجب ہے، اسے، غور سے ہم سنتے ہیں
کہیں آپس میں اگر ذکرِ وفا ہوتا ہے

جبہہ سا دیکھیے جبرئیل کو جس جا عارفؔ
کچھ شک نہیں ہم کو وہ درِ آلِ عبا ہوتا ہے

(۵۸)

جہاں سے دوشِ عزیزاں پہ بار ہو کے چلے
یہ سوئے ملکِ عدم شرمسار ہو کے چلے

ہمارے دیکھنے کو خوش ابھی سے ہیں اعدا
ذرا نہ دیکھ سکے اشک بار ہو کے چلے

پہنچ ہی جاؤ گے میخانے میں خضر تم بھی
ہمارے ساتھ جو یاروں کے یار ہو کے چلے

تمھاری رہ کا رہا ہم کو ہر طرف دھوکا
چلے جدھر کو سو بے اختیار ہو کے چلے

ثنا نگار یہ ہے کس کے خلق کا عارفؔ
قلم، ورق پہ نہ کیوں اشکبار ہو کے چلے

(۵۹)

دردِ دل ضعف میں اے یار اٹھے اور بیٹھے
ہے یہ مشکل تیرا بیمار اٹھے اور بیٹھے

اثرِ آہ یہ غالب میری قسمت اے ہے
پاس اس کے جو یہ اغیار اٹھے اور بیٹھے

کچھ تو تھا نقص میرے شوقِ شہادت میں آج
ہاتھ میں لے کے وہ تلوار اٹھے اور بیٹھے

جس زمیں پر کہ مرے ضعف کا ہو جائے اثر
واں جو تقصیر ہو دیوار اٹھے اور بیٹھے

طمع کے جذبے سے عارفؔ کوئی پڑھتا ہے نماز
ہائے افسوس کہ بے کار اٹھے اور بیٹھے

(۶۰)

کون بے وارثوں کا ہوتا ہے
مر بھی جاویں تو کون روتا ہے

دیدۂ تر بھی ساتھ ہے اپنی
نیکی کس واسطے ڈبوتا ہے

اک سوا میرے بخت کے ہمدم
کون افغاں سے مری روتا ہے

دیکھ روتے ہیں کس طرح موتی
یوں ترا خستہ دل یہ روتا ہے

اعتنا بھی اُسے نہیں عارفؔ
مفت کیوں اپنی جان کھوتا ہے

(۶۱)

آتے ہی مری لاش پہ ناگہہ جو جی گئے
ڈر کر تمام بھاگ میرے ماتمی گئے

کیا دیکھتے ہی ان کے چپ سی لگ گئی
گویا کہ آن کر وہ میرے منہ کو سی گئے

اُگلے وہ زہر پر ہمیں شربت کے گھونٹ ہیں
جو بات ان کے منہ سے سنی اُس کو پی گئے

مشہور وہ ہوا ہے جو یوسف جہان میں
ہم تا بہ مصر پوچھنے اس کی گلی گئے

تاب و توان و صبر و خرد عشق میں کہاں
یک بار اپنے پاس سے عارفؔ سبھی گئے

(۶۲)

جنت پہ مجھ کو تیرے جو گھر کا گمان ہے
رضواں سے پوچھتا ہوں یہ کس کا مکان ہے

میں شاد ہوں کہ گھر میرے، وہ میہمان ہے
گھر کی تباہ حالی کا کس کو دھیان ہے

وہ کہتے کہتے بات جو مجھ سے چبا گئے
نزدیک ان کے بات بھی شاید کہ پان ہے

مطلب کسی کی گرمیِ بازار سے نہیں
کن مدّتوں سے ہم نے بڑھائی دکان ہے

عارفؔ شبِ فراق کو سن کر میری فغاں
کہنے لگے کہ یہ بھی بڑا سخت جان ہے

(۶۳)

وہ حال ہے کہ دیکھے سے کل میرے حال کے
وہ جاسکے نہ اپنے کو ہرگز سنبھال کے

قاتل لہو نہیں تنِ لاغر میں نام کو
کرتا ہے ذبح کیوں مجھے دامن سنبھال کے

اے سیم تن نہ بوالہوسوں سے تپاک رکھ
عاشق کہاں یہ تاکنے والے ہیں مال کے

واقع میں کچھ نہ ناخنِ عقدہ کشا نہیں
سو ٹکڑے ورنہ ہوتے فلک پر ہلال کے

جن کو کہ دیکھنے سے اٹھائیں خمار نین؟
اشعار ہیں وہ عارفِ نازک خیال کے

(۶۴)

آثار یاں ہیں حشر میں جو تری چال کے
مرقد سے تاکتا ہوں تجھے سر نکال کے

ہے خوف مجھ کو بھی کہ اسیری کا ہم سفیر
گلشن میں سب درخت سمجھتا ہوں جال کے

کھینچے ہے اس طرح اثرِ جذبِ شوقِ دید
میں دیکھتا ہوں کب انھیں آنکھیں نکال کے

میل اس میں کچھ خوشی کا نہ ہو اس لحاظ سے
کھاتے ہیں غم بھی عشق میں ہم دیکھ بھال کے

ڈرتا ہوں میں ترے لبِ شیریں تو وہ نہیں
اشعار پڑھ کے عارفؔ شیریں مقال کے

(۶۵)

لے چلے اشکِ رواں ہم کو بہا کے گھر سے
جانبِ دشت چلے ہاتھ اٹھا کے گھر سے

غم غذا ہے مری وہ آپ کے دشمن کھائیں
تم جو یاں آئے تو کیوں آئے نہ کھا کے گھر سے

غیر کے نام کا خط میں نے غلط پکڑا ہے
گر ہوا رشاد تو لے آؤں میں جا کے گھر سے

شمع رو اس لیے خالق نے بنایا ہم کو
کہ نکلواتے ہو تم مجھ کو جلا کے گھر سے

کھود نے گھر وہ میرا آئیں تو آئیں عارفؔ
لے گئے فرش تلک کل تو اٹھا کے گھر سے

(۶۶)

سرو سامان ہے کس گھر کے بنانے کے لیے
آئے گا کام ترے غم میں لُٹانے کے لیے

اے فلک خاک بھی دینے میں تردّد اتنا
مانگتے زر تو نہیں تجھ سے اڑانے کے لیے

جائے ایمان تو غم کیا ہے رہے تاب و تواں
یہ ہے درکار ترے ناز اٹھانے کے لیے

ہووے یارب جو مجھے بسترِ راحت کی طلب
ڈھیر کانٹوں کا نہ پیدا ہو سرہانے کے لیے

شور زنداں میں جو کرنا ہے، کیا کر عارفؔ
چھوڑ دیں گے تجھے پھر خاک اڑانے کے لیے

(۶۷)

عدو کا ذکر سنوں ہے یہ ناگوار مجھے
بلا سے آپ سمجھیے نہ راز دار مجھے

تیرے ہی دل میں رہوں دشمنوں کی جانب سے
جو خاک کر کے بنادے فلک غبار مجھے

بشر تو کیا ہے سنا جب سے زہرہ کا قصہ
رہا نہیں ہے فرشتوں کا اعتبار مجھے

تیرے قریب میں کیوں آگیا میری شامت
دیا تھا حق نے دلِ ناامیدوار مجھے

خلافِ عقل جو کرتے ہیں کام وہ اکثر
کیا ہے یاس نے عارفؔ امیدوار مجھے

(۶۸)

وہ آئے نعش پہ کرنے کو شرمسار مجھے
یہ ان کے آنے کا کیسا تھا انتظار مجھے

جو دن کے آنے کا اقرار بے تامّل ہے
وہ خوب جانتے ہیں تیرہ روزگار مجھے

جنوں میں نالۂ خارا گداز کی دولت؟
نصیب خاک ہوئی سیر کوہسار مجھے

ستم وہ اس کا وفا یہ میری مگر دل پر
نہ اختیار اُسے ہے نہ اختیار مجھے

غلط ہے دل کو کہاں دل سے راہ ہے عارفؔ
نہ کہیے چین انھیں ہے نہ ہے قرار مجھے

کیا کہیں ہم تھے کہ یا دیدۂ تر بیٹھ گئے
قلزمِ اشک میں جوں لختِ جگر بیٹھ گئے

ناتواں ہم تری بزم سے نکلے کیونکر؟
کسے معلوم ہے ہم آ کے کدھر بیٹھ گئے

آپ کو خون کے آنسو ہی رلانا ہوگا
حالِ دل کہنے کو ہم اپنا اگر بیٹھ گئے

کس کو اک دم کا بھروسہ ہے کہ مانندِ حباب
بحرِ ہستی میں اِدھر آئے اُدھر بیٹھ گئے

دور سمجھا ہے رقیبوں کو یہاں سے عارفؔ
یار کے پاس جو بے خوف و خطر بیٹھ گئے

(۷۰)

ہم زندہ کیوں رہیں؟ نہ وہ ہم سے اگر ملے
کس منہ سے ہم کہیں کہ نہ وہ عمر بھر ملے

تھی مرغِ نامہ بر کی مجھے اپنے جستجو
مدّت کے بعد کوچہ جاناں میں پر ملے

پھرتا ہوں ساتھ گھر لیے خانہ بدوش ہوں
جب تک نہ میں ملوں تو میرا کس کو گھر ملے

زاہد کریں گے دھوم سے مسجد میں روشنی
ہم کو شراب خانے کی خدمت اگر ملے

عارفؔ رقیب اس کو سمجھیے نہ راہ میں
کوئی دیارِ عشق میں جو راہبر ملے

(۷۱)

کیا کہوں کیا دہر میں ترے گدا کی شان ہے
شک نہیں ہے اردشیر بادشاہ کی شان ہے

چرخِ ہفتم میں پہنچ کر ہو جسے عزمِ عروج
اس بلندی پر میری آہِ رسا کی شان ہے

سجدہ گاہ خلق جیسا کعبہ ہے ویسا ہے دیر
بت خدائی کرتے ہیں یہ بھی خدا کی شان ہے

پوچھنا کیا ہے بیاں مجھ سے دیارِ عشق کا
واں کے زاغِ دشت میں اے دل ہما کی شان ہے

کل تلک ایک بات بھی جن کو نہ کہنی آتی تھی
آج وہ شاعر ہوئے یہ بھی خدا کی شان ہے

(۷۲)

دل لے گئے اور اس کی خبر کچھ نہیں کہتے
کہتے ہو کہ دیویں گے دگر کچھ نہیں کہتے

پہنچا دے درِ یار تلک خاک ہماری
ہم اور تو اے بادِ سحر کچھ نہیں کہتے

گو پر نہیں اڑ جائے ہے پر بن کے بھبوکا
وہ شوخ پری ہے کہ بشر کچھ نہیں کہتے

کیوں آنکھ ملاتے نہیں گھر آ کے ہمارے
ہم آہ کا تو اپنے اثر کچھ نہیں کہتے

یکساں ہی سے معلوم ہمیں ہوتے ہیں عارفؔ
مضمون ہیں ترے یا ہیں گوہر کچھ نہیں کہتے

(۷۳)

جو راہِ وصل تیری دلربا نکلتی ہے
ہمارے کشورِ دل میں وہ جا نکلتی ہے

اگرچہ رونے سے حاصل نہیں ہے کچھ ہمدم
بجز اس دل کی ذرا کی ذرا نکلتی ہے

شبِ فراق میں ناگاہ کیسے آپہنچی
اجل کے واسطے دل سے دعا نکلتی ہے

غلط جو شکوہ کروں تجھ سے بے رخی کا تیری
کہ بے ادائی میں بھی اک ادا نکلتی ہے

میرے کلام کو تو دیکھ عذر سے عارف
یہ طرز کس کے سخن میں بھلا نکلتی ہے

(۷۴)

چرخ کی دولت سے زر، ہر بے ہنر کے پاس ہے
اپنی بھی قسمت کا کچھ اس فتنہ گر کے پاس ہے

اُس کے آنے کی خوشی سے بڑھ گیا ہوں اس قدر
کنگرہ، عرشِ بریں کا مرے سر کے پاس ہے

ایک دن میخانے کی جانب وہ آنکلیں کہیں
ہے وہی پیرِ مغاں کا جو خضر کے پاس ہے

یہ بھی رونا ہے کوئی اے دیدہ ہائے دجلہ ریز
موجۂ خونِ جگر اب تک کمر کے پاس ہے

خواب میں ڈرتا ہوں میں ہر شب بلائیں دیکھ کر
کیا کہیں عارف کا مسکن تیرے گھر کے پاس ہے

(۷۵)

میرے احوال کی خبر کچھ ہے
پہلے سے بھی خراب تر کچھ ہے

نہیں دل خواہ کوئی ویرانہ
ہے تو ایسا ہی میرا گھر کچھ ہے

کوئی کیا خاک مجھ کو سمجھائے
شام کچھ مشکل ہے سحر کچھ ہے

ایک دو آسماں ڈبوئے تو کیا
ہم سمجھتے ہیں چشمِ تر کچھ ہے

گرم بازاریِ سخن عارف
اپنے ہی دم سے ہے اگر کچھ ہے

(۷۶)

جب حرفِ کینہ دل سے ترے سیم بر مٹے
دھو ڈالنے سے سکہ درم کا اگر مٹے

منقوش دل میں جو ہے نہ جائے گا ناصحا
کیونکر لکیر ہاتھ کی اے بے خبر مٹے

غزل (۷۵) کے مقطعے میں 'محوؔ' کا ذکر آیا ہے۔ 'محوؔ' عارفؔ کے دوستوں میں ہیں۔ غالبؔ نے قطعے کے شاعروں کا جہاں ذکر کیا ہے وہ ان کو لینے آئے تھے۔ اس معنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عارف نے بعض مواقع پر اپنے دوستوں کا بھی ذکر کیا ہے جیسا کہ اس موقعے پر محوؔ کا ذکر آیا ہے۔

اب نام کو بھی خاک ہمارا نشاں ملے
مدت ہوئی کہ کوچۂ جاناں میں مر مٹے
نامے میں کوئی مطلبِ دل گر رقم کروں
وہ خود بہ خود یقیں ہے مجھے سر بسر مٹے
چینِ جبینِ یار کو عارفؔ میں کیا کروں
اپنے مٹانے سے خطِ تقدیر اگر مٹے

(۷۷)

فکر ہی ہم کو ہے کیا وہ بُت ہمارے گھر پڑے
کیا کہیں ہم کیا ہماری محفل پر پتھر پڑے
دیکھ کر اس شوخ کو ہر اک کہتا ہے یہی
الاماں یارب یہ بھی دیکھیے کس پر پڑے
اپنی نیکی پر کروں کیا وسعتِ دل کا بیاں
جس کے ایک گوشے میں ہیں سوداماں محشر پڑے
یا کسی کی زلف میں ہو یا کسی کی راہ میں
چین سینے میں دلِ بیتاب کو کیوں کر پڑے
درد ہے اس بات کا ہم کس مرض کی ہیں دوا
سوچتے ہیں دل میں عارفؔ ہم بھی یہ اکثر پڑے

(۷۸)

سینے کو میرا زخمِ جگر خیر سے وہ آئے
ناکے میں سوئی کے جنھیں تاگا نہ پرو آئے
عالم میں پڑا تہلکہ رونے کا ہمارے
جس شہر میں دو دن رہے وہ شہر ڈبو آئے
معلوم ہے کیا حال مری سختیِ جاں کا
خنجر جو مرے قتل کو وہ باندھ کے دو آئے
مفلس ہوں وگرنہ تیری زلفوں سے زیادہ
زخمِ جگر و دل سے میرے مشک کی بو آئے
یہ سیرِ حرم ہم کو سعادت بھی ہے عارفؔ
واں جاکے ہی رو آتے ہیں واں جاکے ہی رو آئے

(۷۹)

میرے گھر میں کب سوا میرے کسی کی جائے ہے
سر بسر ویراں ہوا ہے اک ہو کی جائے ہے
ایسے میں اے دل پکا لے گر ہو خامی عشق میں
آج خالی مفت میں اُس شعلہ رو کی جائے ہے
یا نبی کا ہوگا مسکن یا خدا کا گھر بنے
کعبہ، اے شیخ حرم کیا ہر کسو کی جائے ہے
چاہتا ہوں تجھ سے یارب میں دلِ بے مدعا
آگ اُس دل میں کہ جس میں روز کی جائے ہے
یا تو یاں ٹوٹا ہے عارفؔ کوئی مینائے گلاب
یا پھر اس گل پیرہن کے شست وشو کی جائے ہے

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں